شاہکار

اُردو کے معیاری ادبی رسائل کا انتخاب

شاہکار

سرپرست —

نیائے شرما

مُدیر —

محمود احمد ہنر

معاون —

انتخاب سید

قیمت
۱/۲۵

۵۸

سالانہ
بارہ روپے

فروری ۱۹۶۹ء

دفتر شاہکار، ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد-۳
لکھنؤ آفس — سروری منزل، کچّا احاطہ، لکھنؤ
بمبئی آفس — ڈائمنڈ لاج، سکندر پیر خاں اسٹریٹ بمبئی ۸۔ فون نمبر ۳۷۷۹۶۵

ترتیب

اپنی بات ... ... محمود احمد ہنر

افسانے

۱ - قاضی عبدالستار ... ... میراث ... ... "گفتگو" بمبئی ۵
۲ - علیم مسرور ... ... دل کا پودا ... "بیسویں صدی" دہلی ۱۴
۳ - آغا سہیل ... ... پتنگا ... ... "فنون" لاہور ۲۷
۴ - حسین شاہد ... ... چوبارے کی اینٹ ... "اوراق" لاہور ۵۳
۵ - فرخندہ لودھی ... ... حرامی ... ... "اردو زبان" سرگودھا ... ۶۳
۶ - انور عنایت اللہ ... ... یادوں کے چراغ ... "الشجاع" کراچی ۷۶
۷ - سید رفیق حسین ... ... گوری ہو گوری ... "ساقی" دہلی ۸۲

نظمیں

۶ - جوش ملیح آبادی ... ... رباعیات ... ... "فنون" لاہور ۹۵
۷ - ن-م-راشد ... ... مسکراہٹیں ... "نیا دور" کراچی ۹۶
۸ - کرشن موہن ... ... تین نظمیں ... "گفتگو" بمبئی ۹۷
۹ - انور معظم ... ... بازار ... ... "صبا" حیدرآباد ۹۸
۱۰ - تاج مہجور ... ... بیوقوف لڑکی ... "صبا" حیدرآباد ۹۸
۱۱ - بلراج کومل ... ... موجِ رواں ... "سیپ" کراچی ۹۹
۱۲ - زبیر رضوی ... ... پرایا احساس ... "سیپ" کراچی ۹۹
۱۳ - ندا فاضلی ... ... دو سہیلیاں ... "سیپ" کراچی ۱۰۰
۱۴ - سید فضل المتین ... ... اشتباہ ... "تحریک" دہلی ۱۰۰
۱۵ - انور سدید ... ... زمین ... "اوراق" لاہور ... ۱۰۱
۱۶ - شہریار ... ... ایک نظم ... "گفتگو" بمبئی ۱۰۱

۱۷ - احمد وصی ... ... کاغذ پہ پھیلا ہوا جھوٹ ... "کتاب" لکھنؤ ۱۰۲

۱۸ - منظر سلیم ... ... لاشش کی التجا ... "کتاب" لکھنؤ ۱۰۲

مضمون

۱۹ - اسلوب احمد انصاری ... شاذ تمکنت ... "اوراق" لاہور ... ۱۰۵

غزلیں

۲۰ - غالب ... ... ترجمہ گوہر ہوشیار پوری ... "فنون" لاہور ۱۲۱

۲۱ - شہزاد احمد ... ... "فنون" لاہور ۱۲۲

۲۲ - احمد ندیم قاسمی ... ... "فنون" لاہور ۱۲۲

۲۳ - خورشید احمد جامی ... ... "الشجاع" کراچی ۱۲۳

۲۴ - سلام مچھلی شہری ... ... "شاعر" بمبئی ۱۲۴

۲۵ - سلیم احمد ... ... "نیا دور" کراچی ۱۲۵

۲۶ - مظہر امام ... ... "سیپ" کراچی ۱۲۵

۲۷ - حرمت الاکرام ... ... "اوراق" لاہور ۱۲۶

۲۸ - عارف عبدالمتین ... ... "اوراق" لاہور ۱۲۶

۲۹ - فضیل جعفری ... ... "اوراق" لاہور ۱۲۷

۳۰ - وزیر آغا ... ... "اوراق" لاہور ۱۲۷

۳۱ - قمر اقبال ... ... "شاعر" بمبئی ۱۲۸

۳۲ - سلطان اختر ... ... "شب خون" الہ آباد ۱۲۸

طنز و مزاح

۳۳ - مجتبیٰ حسین ... ... تکیہ کلام ... "تکلف بر طرف" ۱۲۹

محمود احمد ہنر ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے نیشنل آرٹ پرنٹرس میں چھپوا کر دفتر رسالہ شاہ کار ۱۲/۲۴ بخشی بازار الہ آباد سے شائع کیا

اپنی بات

پچھلے دنوں مدیر "شاہ کار" کو بمبئی جانے کا اتفاق ہوا اور دوسرے دورے میں حیدرآباد اور سابق ریاست حیدرآباد کے اضلاع اورنگ آباد، جالنہ، پربھنی اور ناندیڑ میں بھی مختصر قیام رہا۔ حیدرآباد جو ایک زمانہ میں اُردو کا ایک بہت مضبوط مرکز تھا اگرچہ اپنی سابقہ حیثیت کھو چکا ہے، لیکن اُردو زبان کے سلسلے میں اب بھی نہ وہاں جوش کی کمی ہے نہ عمل کی۔ حیدرآباد کی انجمن ترقی اُردو اپنی کارگزاریوں کے اعتبار سے غالباً ملک کی ہر ریاستی شاخ سے آگے ہے۔ وہاں اُردو والوں میں ایک زندگی ہے، ایک حرارت ہے اور وہ اپنی زبان کو زندہ رکھنے، اس کی حفاظت کرنے کے لئے ہر طرح تیار ہیں۔ راقم الحروف جہاں اہل دکن کی اُردو دوستی اور اپنی زبان کے لئے ان کی بے پناہ محبت دیکھ کر خوش ہوتا رہا وہیں اپنے صوبہ یو۔ پی میں اُردو کی زبوں حالی اور اُردو والوں کی بے عملی اور بے حسی پر افسوس بھی کرتا رہا۔

حیدرآباد میں نظام کے زمانے میں اُردو کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ جامعہ عثمانیہ ملک کی واحد یونیورسٹی تھی، جہاں ذریعہ تعلیم اُردو تھا۔ وہاں ریاست کے انضمام کے بعد اُردو والوں کو ہم یو۔ پی والوں سے زیادہ مایوس ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اہلِ دکن میں خواہ وہ حیدرآباد کے ہوں یا مہاراشٹر اور میسور میں شامل ہو جانے والے علاقوں کے ہوں، ان میں اب بھی نہ وہ مایوسی ہے نہ شکست خوردگی جو ہم یو۔ پی والوں کی عادت بن چکی ہے کہ خود کچھ نہ کریں گے بلکہ اس انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے کہ حکومت اُردو کے لئے کچھ کر دے گی تو ہو جائیگا۔ مہاراشٹر میں ناسک کے ایک قصبہ مالیگاؤں میں چلے جایئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ یو۔ پی کے کسی شہر میں ہیں۔ ہر طرف آپ کو اُردو ہی اُردو نظر آئے گی۔ دیگر اضلاع میں بھی آپ کو اردو اسکول بھی ملیں گے اور اردو کالج بھی۔ حیدرآباد میں اردو ہال اور اُردو کالج ریاست کے خاتمہ کے بعد قائم ہوئے ہیں اور شان سے چل رہے ہیں۔ ہم تو لکھنؤ میں بھی کچھ نہ کر سکے۔

یہ کہا جاسکتا ہے اور ایک حد تک صحیح بھی ہے کہ مہاراشٹر یا اندھرا میں حکومتوں کا اردو

بقیہ صفحہ ۱۴۴ پر

قاضی عبدالستّار

میراث

رات سو رہی تھی لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ بادل کی رضائی کہیں کہیں سے مَسک گئی تھی اور اکا دکّا ستارے چمک اُٹھتے تھے۔ پھر ایک ساتھ کئی گھنٹیاں کھنک اٹھیں۔ اس نے چوڑے چکلے پلنگ پر تھکا ہارا بھاری بھرکم جسم اور پھیلا لیا۔ پھر گھنگھروؤں نے چٹکی لی۔ اس نے کاہلی سے کروٹ بدل کر دیکھا۔ آنگن کے بائیں چھپّر کے آگے پرنیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اس کے اپنے ہاتھ سے خریدے ہوئے جانور اُجلے کالے دھبّوں کی طرح کھڑے بیٹھے تھے اور کنمنا رہے تھے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ ٹارچ ٹٹولنے لگا۔ لیکن پکڑ میں کارتوس آگئے۔ اُس نے حاملہ عورتوں کی طرح پورا بدن موڑ کر سرہانے سے قالین کا کونا اُلٹ دیا۔ اندھیرے میں بھی بندوق کا کُندا نظر آگیا۔ اُس نے بندوق اُٹھالی۔ سیاہ، چکنی، ٹھنڈی نالوں کو پیار کیا۔ پھر آسمان کی طرف سیدھی کر کے کارتوس لگا دئے اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بیچوں بیچ قالین پر سوئے ہوئے ضدّی بچے کی طرح آہستہ سے لٹا دیا اور آٹھ سیلوں کی لمبی ٹارچ اُٹھا کر جانوروں کی طرف چلا۔ جب لال اینٹوں کی نئی دیوار میں لگے ہوئے پھاٹک کے سامنے سے گزرا تو پاؤں دغے ہوئے گولے کے جلے ہوئے بان پر پڑ گیا اور اس کی ناک بارود کی خوشبو سے بھر گئی۔ دنیا کی بہترین خوشبو سے چھلک اُٹھی۔ کان دنادن کی آوازوں سے گونجنے لگے۔ سورج چھپنے

سے پہلے وہ سرپنچ عدالت کا چناؤ جیت چکا تھا اور لوگ اسے بدھائیاں دے رہے تھے۔ نیلو مہتیا کی جے جے کار کر رہے تھے۔ رگھو چمار نے تو اس کے گلے میں کلا بتو کا ہار بھی ڈال دیا تھا جسے اس نے بڑے ٹھاکر کی طرح اُتار کر بڑگو کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا۔ جب بلاک کا پہلا پہلا الکشن ہوا اور بڑے ٹھاکر جیت گئے اور رتوالپور کے پنڈت نے ان کو ہار پہنایا تھا تو انھوں نے پہنا کہاں تھا۔ کھڑے کھڑے اتار کر کسی سپاہی خدمت گار کو پکڑا دیا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے پیروں پہ جلدی جلدی چلتا ہوا آیا۔ پانچ دروازوں والا لمبا کمرہ بند تھا۔ اس نے چوروں کی طرح زنجیر کھولی۔ دیوار پہ جہاں بیلوں کی ہمیلیں اور اندھیریاں ٹنگی تھیں وہیں روشنی کے تیز گولدارے میں اُس کا ہار جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اس نے اُتار کر پہن لیا اور اپنے آپ پر نگاہ کی تو جیسے ہزاروں من مٹی کے نیچے مدتوں کے سوئے خواب انگڑائیاں لینے لگے۔ وہ دیر تک اس کمرے میں کھڑا رہا جس میں ایک طرف چھت تک بھوسہ بھرا تھا اور جس کی دھندک سے کمرہ دہک رہا تھا۔ جب اس کے ننگے پیر پر پسینے کے قطرے کھٹملوں کی طرح رینگنے لگے تو وہ باہر نکلا آم کے بور کی خوشبو کا گہنا پہنے ٹھنڈی ہوا نے اُسے اپنے آپ میں سمیٹ لیا۔ اب چرخی پہ ہنگامہ کھولنے لگا تھا۔ اس نے جلتی ہوئی ٹارچ قالین پر لٹا دی اور اسی طرح ہار پہنے پہنے، کندھے پہ بندوق رکھے جانوروں کی طرف اس طرح چلا جیسے بڑے ٹھاکر گڑھی سے نکل رہے ہوں۔ اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر اپنے جانور دیکھے اور بیلوں کے ماتھے اور بھینسوں کے پٹھے سہلائے۔ پھر سانی پانی کرنے والوں کو ڈانٹنے کے لئے گردن کھا کر مُنہ کھول دیا۔ مگر خیال آگیا کہ وہ اکیلا ہے اور رات باقی ہے۔ پھر گھر گھر چلنے والی چکیوں اور پنہاریوں کے گیتوں کی ٹھمک ٹھمک چلتی ہوئی آوازوں نے اُسے گھیر لیا۔ جیسے موٹی عورتیں ناچ رہی ہوں اور ان کے گھنگھروؤں کے ساتھ سنئے ماڑی نئے بھاری بھاری لہنگے سرسرا رہے ہوں۔ اُس نے چونک کر اس طرف دیکھا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں اور اس طرح دیکھا کہ اگر دن ہوتا تو اپنی عدالت میں مقدمہ قائم کر دیتا۔

پھر اس کے اپنے گھر سے اٹھا دھری کی آوازیں آنے لگیں۔ بڑکو، منجھلو اور چھٹکو کھانسنے کھنکارنے لگے۔ ان کی دلہنیں بولنے بتلانے لگیں اور لونڈے چیخنے چلانے لگے اور نیم کی پھنگیوں پر سُرخی چمکنے لگی۔ جیسے سنہری چڑیوں کی قطار بیٹھی ہو، تو اسے یقین آ گیا کہ سچ مچ صبح ہو گئی ہے۔ اس نے جلدی سے کارتوس نکال کر بندوق قالین کے نیچے چھپا دی اور دھم دھم چلتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ گلے سے ہار۔۔۔ اپنی جیت کا تمسک اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور اطمینان سے قالین پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ آج کی رات اتنی جلدی کیسے گزر گئی۔ آگے تو چوٹ کھائے ہوئے کچھوے کی طرح راتیں رینگتی رہتیں۔ کروٹیں بدلتے بدلتے کولھے اور کندھے درد کرنے لگتے۔ چلمیں پیتے پیتے سینہ دھونکنی ہو جاتا اور آج کی رات۔۔۔ جیسے کلاں راسی گھوڑا بات کی بات میں کاوے کاٹ گیا ہو۔

وہ اپنے اونچے سفید بیلوں کی جوڑ دیکھ رہا تھا۔ نوکر سینگوں میں سیاہی لگا رہے تھے کہ رگھو چمار آ گیا۔ دبلا پتلا جھکا ہوا سن سفید رگھو چمار لال انگوچھا باندھے تھا۔ جس میں سے نکلی ہوئی پنڈلیاں سڑی لکڑیوں کے مانند بے جان اور گھناؤنی تھیں۔ چہرے پر جھرّیوں اور زرد بالوں کے علاوہ جھرّیوں کی کتالی میں آنکھوں کے ڈھیلے کیچڑ اور خوف میں لتھڑے پڑے تھے۔ لکڑی کے سے سوکھے ہاتھوں میں ایک بڑا سا دونا لرز رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ اس کے ہونٹ چلتے رہے۔ پھر ملّو مہتیا نے اس کو پہچانتی نگاہ سے دیکھا اور رگھو نے دونا مہتیا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ مہتیا نے مٹھائی ایک نوکر کے سیاہ ہاتھوں میں تھما دی اور ناریل کی نہال دانتوں میں داب کر دونوں ابرو اچکائے۔

"پیار تھنا ہے آپ سے۔"

ایک جملے کا بوجھ اتار کر رگھو ہانپنے لگا۔ ملّو مہتیا اسی طرح دھواں اگلتے رہے اور ادھر دیکھتے رہے جہاں چھٹکو پالکی کی چھت پر کہیں رکھے منگنی سے واپس آئی ہوئی جاجمیں اور دریاں نہار رہا تھا۔ مہتیا نے پھر سُنا۔

"ایک پلنگ بر بر دھرتی ہے... ٹُل ایک وکھت کی روٹی دے سکت ہے۔"

مہتیا نے نگاہ اُٹھائی۔ مگر اب رگھوا چل نکلا تھا۔

"مورا کاہے؟... آج مرا کل دوسرا دن... ٹُل چھوٹے چھوٹے بن باپ کے بچے بلکت ہیں۔ اور کھنڈر ماں آپ سمجھو لونا بھرا پڑا ہے۔ اگر دیواریں گرائے کے تماکو بوئے دین جائے تو ہجارہ روپیہ کھڑا ہوئے جائے۔"

اور رگھو کی جھولی خالی ہوگئی۔ مہتیا نے پھاٹک کی طرف نگاہ کی۔ جالم چوکیدار آرہا تھا۔ خاکی کوٹ پر پیتل کی چپراس اور لال صافہ باندھے اور کندھے پر بلّم رکھے وہ بالکل پاس آگیا۔ مہتیا نے پلنگ پر اس خوف سے دور تک اپنے پاؤں پھیلا لئے کہ کہیں چوکیدار ان کے برابر نہ بیٹھ جائے اور دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑے ہوئے ناریل کو منہ سے ہٹائے بغیر پوچھا۔

"کاہے جالم....؟"

"سب کچہری بھر گئی اور تمہار راہ تکی جائے رہی ہے۔"

یہ ایک جملہ ریڑھ کی ہڈی میں برن کے خنجر کی طرح اوپر سے نیچے تک تیر گیا۔ جب چلم جل گئی اور چوکیدار جماہیاں لینے لگا تب کہیں مہتیا اُٹھے۔ نئے کنوئیں کی جگت کے نیچے پکی چبوترا پر کھڑے ہوکر پاؤں دھوئے۔ تیل پلائے جوتے پہن کر رگھوا کو نگاہوں سے رخصت کیا اور گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی ہانک لگائی۔

"ارے کہاں ہو... بڑکو کی مہتاری؟"

بڑی بہو جو منجھلی بہو کے پاؤں کی ایڑی رنگ رہی تھی ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔ چھوٹی اسی طرح بیٹھی اپنے پیٹی کوٹ پر پھول کاڑھتی رہی اور بڑکو کی مہتاری سوپ میں بھنے ہوئے چنے پھٹکتی ہوئی دوسری تدواری سے نکل آئیں اور پوری آواز سے چیخیں۔



شاذ تمکنت



"کہو۔"

"ہمار کرتا کہاں ہے ؟ نوا !"

"کا ہے ؟"

"ارے عدالت مکدمے لئے بیٹھی ہے اور تم کا ہے کا ہے لگائے ہو۔"

اور بڑکؤ کی مہتاری کے طباق جیسے چوڑے سرمئی چہرے پر گلابی رنگ کا پتارہ پھر گیا۔ سوپ کو دہلیز کے حوالے کر کے کھٹیا کے اوپر سے اچک کر گٹھری اتار لی اور بھاگل پوری چادر کا کرتا نکال کر مہتیا کو پکڑا دیا اور جھپاک سے کوٹھری میں گھس گئیں۔ مہتیا گاندھی بابا کی ٹوپی پہن رہے تھے کہ وہ نیا سوپ لے کر آگئیں اور رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

"پہلا پہلا مکدمہ ہے ... بھگوان سب نیک کریں۔"

اور سوپ جس میں گیندے کے پھول، سوکھے لڈو، تلچوری کے دانے، پان کے پتے اور چراغ رکھے تھے، ان کے منھ کے آگے چپکے چپکے نچانے لگیں۔ مہتیا نے جو گھر والی کے منھ کی جھرّیوں پر آنسوؤں کے قطرے ڈولتے دیکھے تو گھٹنے کانپنے لگے لیکن چندن سے بھری ہوئی موٹی موٹی انگلیوں کے لمس نے اُن کی ہمت بندھائی۔ گھونگھٹوں سے جھانکتی ہوئی سیاہ چمکیلی آنکھوں سے برستی ہوئی دعاؤں نے ڈھیرج دی اور وہ اپنے پیروں پر گھسٹتے ہوئے باہر نکل آئے۔

جالم چوکیدار اس کے پھاٹک سے دور بلّی سڑک پر گرام سبھا کی لالٹین کے نیچے کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ ان کو آتا دیکھ کر آگے آگے چلنے لگا۔ مہتیا اس کی چالاکی تاڑ گئے اور بڑھاپے کے باوجود ایسا جھوم کر چلے کہ چوکیدار پیچھے رہ گیا۔ اب وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں گڈھی کا پھاٹک ہوا کرتا تھا اور پہرہ کھڑا ہوتا تھا اور اب وہاں موٹر کاریاں کھڑی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اس عمارت کے سامنے سے گزرے جو کبھی دیوان خانہ تھا اور جس میں اُلٹی سیدھی دیواریں کھینچ کر بی۔ ڈی۔ اُو نے مکان بنا لیا تھا اور جسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی شخص

نے لنگی ورکنٹراؤں پہن کر ٹائی باندھ لی ہو اور ہیٹ لگا لیا ہو۔ اب املیوں اور نیم کے بوڑھے درختوں کی آڑ میں کھڑی ہوئی سفید عمارت چمکنے لگی تھی۔ یہ بڑے ٹھاکر کی کچہری تھی جسے مرتے وقت وہ گرام سبھا کو دان کر گئے تھے اور جس کے ہال میں جاج پور کی عدالت پنچایت بیٹھتی تھی۔ اور دوسرے حصوں میں ہسپتال، پنچایت گھر، اسٹور اور پردھان کا دفتر تھا۔

آدمیوں سے جھجکتے ہوئے دالان کی سُرخ کامدار سیڑھیوں پر جب اس نے پاؤں رکھا تو پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ آدمیوں کی دیوار پھاڑ کر وہ ہال میں داخل ہوئے، جس کے ننگے گلابی فرش پر دیوار کے نیچے چوکی بچھی تھی۔ اس کے دونوں طرف ٹیڑھی میڑھی قطاروں میں مونڈھوں پر عدالت کے ممبر براجمان تھے۔ وہ چوکی کے پاس پہنچ کر ٹھٹک گیا تو سکریٹری نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ جب خون کی باڑھ اُتر گئی اور سینے میں چلتی چکّی تھم گئی اور سکریٹری پنڈت گرجا شنکر نے پاسنگ شو سگریٹ چوکی کے پائے سے بجھا کر اپنے کان میں لگالی اور بائیں کان سے قلم اُتار کر رگھو ولد دھاندھو ساکن موضع جاج پور کے مقدمے کی کارروائی شروع کردی اور جالم چوکیدار نے رگھو ولد دھاندھو کے نام کی پھُسپھُسی آواز میں ہانک لگائی اور انھوں نے نفرت سے سوچا کہ یہی جالم چوکیدار اپنے تھانیدار کے سامنے کیسا ریل گاڑی کے انجن کی طرح ڈہکتا تھا۔ اور پھر ملّو مہنیا کی نگاہ اندھے گھڑے دروازوں سے گزر کر اس ستون سے لپٹ گئی جس کا رنگ اُڑ گیا تھا نقش ونگار مٹ گئے تھے پلستر گر گیا تھا اور اینٹیں جھانکنے لگی تھیں۔ اور اب گویا وہ ستون نہیں تھا بلکہ خود ملّو مہنیا لنگوٹی باندھے کھڑا تھا اور اس کے جسم پر منڈھی ہوئی بتر وہی کھال سے پسلیاں جھلک رہی تھیں اور ملّو مہنیا نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اب سکریٹری دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی مسل پڑھ رہا تھا۔

"مسمّی رگھو ولد دھاندھو قوم چمار ساکن جاج پور کو مکان مذکور دوسری غیر منقولہ جائداد کی طرح اپنے باپ دھاندھو ولد چرلو سے وراثت میں ملا تھا۔ رگھو بلا شرکت غیرے تیس برس تک قابض و ساکن رہا۔ پھر تلاش معاش میں لکھنؤ چلا گیا۔ عدم موجودگی میں

مکان مذکورہ آفات ارضی و سماوی کے ہاتھوں کھنڈر ہو گیا اور گرام سبھا نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ لیکن قبل اس کے کہ ضابطے کی کوئی کارروائی عمل میں آوے، مسمی رگھو ولد دھاندھو شہر سے واپس آگیا اور مدعی ہوا کہ مکان مذکور کی حقیت سے گرام سبھا اس کے حق میں دست بردار ہو جائے۔ بڈھ پردھان نے جو آپ کے بڑے بیٹے ہیں مقدمہ عدالت پنچائت کے سپرد کر دیا ہے۔ اب عدالت جو فیصلہ کرے۔"

اب رگھو ولد دھاندھو قتل کے ملزم کی طرح خیالی کٹھرے میں کھڑا کانپ رہا تھا، گڑگڑایا۔

"حجور... پنچ پرمیشور! میری جوت میں دو بیگھا جمین بھی نائیں ہے۔ اٹھ کے میرا گھر میں کا دان دے سکت ہو۔"

اور رگھو نے آنکھوں میں بھرا ہوا کیچڑ انگوچھے کے کونے سے پونچھ لیا۔ عدالت کے سکوت پر اس کے ہونٹ لو کے مارے ہوئے آم کی پھانکوں کے مانند لرزنے لگے۔ جیسے وہ بھگوان سے بنتی کر رہے ہوں۔ اُپکار کی پرارتھنا کر رہے ہوں۔ اور بھگوان سرپنچ کا روپ دھارے سامنے کے ستون پر آنکھیں گاڑے بیٹھا تھا۔ اور دیکھ رہا تھا کہ آج سے بیس برس پہلے اسی دالان کے اسی ستون کے پاس کھڑا ہے اور وہ بڑے ٹھاکر کے ہتھ چھٹ سپاہیوں کی مار سے پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ اور جب وہ آج کا ملّو مہتیا اور کل کا ملّوا لُہار بڑے ٹھاکر سے کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو اس کے سر پر اُلٹے ٹھوکے ہوئے جوتے کا بھرا کا ہوتا۔ پھر اس کی آنسوؤں سے دھندلی آنکھوں نے دیکھا کہ یہ اندھے کھڑے دروازے رنگ برنگ کے شیشوں کی اَن گنت آنکھیں کھولے کھڑے ہیں۔ ریشمی پردے پلکوں کی طرح اُلٹے پڑے ہیں۔ یہیں جہاں یہ ننگی بوچی چھت پڑی ہے، سیاہ چمکیلی کوچ بچھی ہے اور بڑے ٹھاکر لیٹے خوشبودار دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے غبارے اڑا رہے ہیں۔ اور وہ ان کے سامنے رگھو کمہار کی طرح کھڑا ہے اور اپنے مقدمے کا آخری عدالت سے فیصلہ سن رہا ہے۔ کہ ملوا لہار

سے ریاست کی تمام زمین نکال لی گئی۔ پھر سرپنچ عدالت جاج پور ملّو مہتیا کی نگاہ، اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر جم گئی۔ جس کا ناخن اسی مارپیٹ میں ٹوٹ گیا تھا اور انگوٹھے پر ناخن کے بجائے بدگوشت نکل آیا تھا۔ سیاہ گھناؤنا بدگوشت۔ انگلیاں اپنے ناخن کی یادگار کو سہلانے لگیں۔ اور آنکھوں کے آگے پانی کے پردے لرزنے لگے جن کے اس پار کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں پوچھ لیں۔ عدالت کے ممبروں نے سرپنچ عدالت کو بھری عدالت میں اس طرح روتے دیکھا تو سناٹے میں آ گئے۔ انھوں نے جن کے پیروں میں عزیزوں دوستوں اور مہربانوں کے اُلجھے ہوئے مفادات کی زنجیریں پڑی تھیں، سکریٹری کے سامنے سے کاغذ کا ایک تختہ اٹھا لیا اور کورے کاغذ پر اپنے دستخط کر دئے۔ انگوٹھے کے نشانات بنا دئے۔ پھر کاغذ سرپنچ کے سامنے رکھ کر مدھم آواز میں بولے۔

"آپ جو حکم چاہیں اس پر لکھ لیں۔"

دیر کے بعد ملّو مہتیا نے پورے بدن کو سرکا کر پاؤں نیچے اُتارے۔ بڑے ٹھاکر کی طرح جھوم کر اُٹھے اور سر کے اشارے سے سکریٹری کو حکم دیا کہ کاغذ قلم لے کر ساتھ چلے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس ہوا جیسے بڑے ٹھاکر دوسرے دروازے سے چلے گئے۔ اس کے بدن کے روئیں جھجک گئے۔ اسے یاد آیا کہ یہ وہی کمرہ ہے جہاں ٹھاکر کچہری سے اُٹھ کر آرام کیا کرتے تھے۔ اُس کی نگاہ اوپر اُٹھ گئی۔ جہاں سلاخوں اور کڑیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تین ٹانگوں کے تخت کے سامنے وہ نیلے چکنے ٹھنڈے فرش پر ایک زانو لوڑ کر بیٹھ گیا۔ سکریٹری نے کاغذ کو گدّے پر جما کر دے دیا۔ اور وہ پوری آدھی صدی کے لئے عبارت بنانے کے لئے سوچنے لگا۔ ایک لمبے چوڑے مفلس گھرانے کا مقدر لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس آسمانی لمحے کی اہمیت کا اسے احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس فیصلے کی تنسیخ سے دیوتا بھی مجبور ہیں۔ اس کو معلوم تھا کہ مقدمہ اتنا چھوٹا ہے کہ اپیل کا ہاتھی اٹھا نہیں سکتا۔

جب وہ کچہری کے ہال میں آیا تو عدالت کھڑی ہوگئی۔ چلمیں اور بیڑیاں مُنھ سے نکل کر ہاتھوں میں سُلگنے لگیں۔ چیختی چنگھاڑتی باتیں خاموش ہوگئیں۔ سوکھی لوکیوں جیسی پنڈلیوں پر رگھو کے کھنکھڑ گھٹنے اور زور سے کانپنے لگے۔ پھر اس کے زرد بالوں سے ڈھکے ہوئے کانوں نے سُنا۔

"عدالت پنچایت جاج پور مدّعی مسمیّ رگھو ولد دھاندھو قوم چمار ساکن جاج پور کا استغاثہ خارج کرتی ہے۔"

اس سے زیادہ سُننے کی تاب نہ تھی۔ پھانسی کی سزا پانے والے دفعات کی تشریح سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

علیم مسرور

دل کا پودا

چاندنی کو اسپتال میں داخل ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ بہترین تدبیریں اور بیش قیمت دوائیں ناکام ہوتی گئیں۔ چاندنی جس رفتار سے ڈھل رہی تھی چمن کی زندگی میں اُس سے بھی زیادہ تیز رفتار سے اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ چمن لال کی زندگی میں چاندنی اپنے بھرپور شباب کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ چمن لال بھی کم دلکش نہ تھا۔ جب کبھی پڑوسی چاندنی اور چمن کو گھل مل کر باتیں کرتے دیکھتے تو کہتے چمن میں چاندنی چھٹک رہی ہے۔ ایسی باتیں سُن کر دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کا پیار اور اُمڈ آتا اور دونوں پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت نظر آنے لگتے۔

آج جب ڈاکٹر شہاب چاندنی کے بیڈ کے پاس پہنچے تو چاندنی نے نہ سر ہی اُٹھایا نہ اُنھیں سلام ہی کیا۔ شہاب نے حسبِ معمول اُس کی نبض دیکھی۔ اُس کے سینے پر آلہ لگایا اور پہلے سے بھی زیادہ تشویشناک انداز میں آلہ ہٹا لیا۔

"کیا کہتا ہے میرا دل؟" چاندنی نے ڈاکٹر شہاب سے نظر ملائے بغیر نہایت ہی نحیف آواز میں پوچھا۔ ڈاکٹر شہاب اس سوال کے لئے تیار نہ تھے، کیا جواب دیتے پچھلے علاج کی ناکامیوں کی پشیمانی میں وہ پہلے کی بہ نسبت خاموش ہوتے جا رہے تھے۔ پھر بھی اُنھوں نے کہا۔

"تم بتاؤ۔"

"میرا دل کہتا ہے کہ چمن پاگل ہو گیا ہے میرے پیارمیں۔ ڈاکٹر! اس سے کہو چاندنی کے ڈھلنے سے اتنا کیوں دیوانہ ہے۔ اس کے گھر میں دوسرا چاند نکل سکتا ہے!" چاندنی نے رک رک کر کہا۔

"تم نے اداس چاندنی دیکھی ہے؟" ڈاکٹر شہاب نے بات بدلنے کی کوشش کی۔ "بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ اداس محبوبہ کی طرح!"

اس سے پہلے کہ چاندنی کچھ جواب دیتی چمن لال آگیا۔ اس کے ہاتھوں میں دواؤں کے بہت سے پیکٹ تھے۔ اس نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! بہت مشکل سے دوائیں ملی ہیں۔ سارا شہر چھان مارا تب کامیابی ہوئی۔"

چاندنی اسی طرح پڑی رہی۔ اس نے پھر بھی سر نہ اٹھایا۔ چمن لال چاندنی کے بیڈ پر ہی بیٹھ گیا اور پوچھا۔

"طبیعت کیسی ہے چاندنی؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر شہاب دواؤں سے متعلق نرس کو ہدایت دے کر دوسرے بیڈ کی طرف چل دئے۔ لیکن ان کی توجہ پھر بھی چاندنی کی طرف سے نہ ہٹی۔ چاندنی کو خاموش پاکر چمن کی طبیعت بیٹھنے لگی۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں پھر پوچھا۔

"چاندنی تمہارا جی کیسا ہے؟"

چاندنی نے سر اٹھایا چمن سے آنکھیں ملیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

چاندنی نے بھرائی ہوئی کمزور آواز میں کہا۔

"تم میرے لئے کہاں تک قرض کرو گے۔ مجھے بھگوان کی مرضی معلوم ہے۔ میں تمہارے اس پیار کو بھی جانتی ہوں جو میرے لئے تمہارے دل میں ہے۔ لیکن تم اس پیار کو نہیں جانتے جو تمہارے لئے میرے دل میں ہے۔ بھگوان کے لئے اب صبر کرلو۔ میرا علاج ہو چکا۔ مجھے بھگوان کی مرضی پہ چھوڑ دو۔ نہیں تو میرے بعد یہ قرض کا بوجھ تمھیں مار ڈالے گا اور... اور..."

چاندنی کی سانس پھولنے لگی۔ چمن نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ زبان سے کچھ کہنے کے قابل ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر شہاب چاندنی کی باتیں سُن ہی نہیں رہے تھے کنکھیوں سے چمن کی حالت بھی دیکھ رہے تھے جو دُکھ کے بوجھ سے ناقابلِ بیان ہو رہی تھی۔ جب ڈاکٹر شہاب اسپتال سے رخصت ہونے لگے تو چمن ان کے پاس آیا اور اس نے نہایت مایوس انداز میں پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! چاندنی کی حالت کیسی ہے؟"

"اچھی نہیں ہے چمن!"

"ڈاکٹر صاحب کوئی صورت نہیں —"

"ڈاکٹر شہاب خاموش رہے۔"

"ڈاکٹر صاحب!" چمن نے پھر کہنا شروع کیا "سُنا ہے آپ تو بیمار دل کی جگہ تندرست انسانوں کے دل لگا دیتے ہیں۔ اگر چاندنی . . . ."

"وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا" ڈاکٹر شہاب نے کہا۔

"کب وقت آئے گا۔ اگر چاندنی مر گئی تو . . . ."

"ڈاکٹر کوشش کرتا ہے۔ کوشش بھگوان سے التجا کا دوسرا نام ہے مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی دل مِل سکا تو میں چاندنی کو بچا لوں گا!"

"ڈاکٹر صاحب! میرا دل لے لیجئے!" چمن نے ڈاکٹر شہاب کے پاؤں پکڑ لئے "میں چاندنی کے لئے مر جانا اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ چاندنی زندہ رہے۔ میرا دل اُس کے سینے میں دھڑکے گا، یہ میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہو گی۔ ہم دونوں کی آتما ایک جسم میں آرام سے رہ لے گی۔"

چمن بے اختیار رونے لگا۔

"چاندنی ٹھیک ہی کہتی ہے کہ چمن اس کے پیار میں پاگل ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کا کام ایک کو مار کر دوسرے کو جلانا نہیں ہے۔ یہ بات بھگوان کو بھی پسند نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم

ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہو۔ چاندنی سچ مچ تمھارے پیار کے قابل ہے لیکن کیا تم جانتے ہو کہ وہ تمھارا دل اپنے سینے میں رکھ کر زندہ رہ سکے گی۔"

"پھر کیا ہوگا ڈاکٹر؟" چمن روتے ہوئے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکنے لگا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں اگر کسی کی موت چاندنی کی زندگی کا سبب بن سکی تو میں دیر نہ کروں گا۔ مرنے والے کی آتما سپھل ہو جائے گی اور چاندنی کا جیون بھی!"

"اگر چاندنی مرگئی تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔ پھر آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میرا مرنا بھی اُس کے کام نہ آسکے؟" چمن نے سسکتے ہوئے کہا۔

"چمن دھیرج رکھو۔ بھگوان کی مرضی کا انتظار کرو۔ یہ عبادت ہے اور عبادت کا پھل ملتا ہے۔"

ڈاکٹر شہاب اپنی کار میں بیٹھ کر اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ وہ دل کے ماہرین میں بہت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ وہ دل کی بیماری اور صحت سے جس قدر آشنا تھے اتنا خود سے بھی نہ تھے۔ لیکن اُنھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ چمن کے دل کے جس گوشے سے اُس کی حسرتیں آواز دے رہی ہیں وہ کہاں ہے؟ دل کے سینکڑوں مریض اُن کے علاج سے شفایاب بھی ہوئے مرے بھی لیکن چاندنی سے انھیں جتنا جذباتی لگاؤ ہو گیا تھا اُتنا کسی مریض سے نہ تھا۔ شائد چاندنی کے حسن اور چمن کی محبت نے اُن کے دل سے غیر محسوس طریقے پر کوئی رشتہ جوڑ لیا تھا۔ کوئی جذبہ بار بار اُنھیں ایک ڈاکٹر سے ایک شاعر بنا دیتا تھا اور وہ دل کی اس رومانی فضا میں پہنچ جاتے تھے جس کے بارے میں ہیومن اَناٹومی اور ہیومن فزیالوجی کی بڑی سے بڑی کتابوں میں بھی کوئی باب نہ تھا۔ اُنھیں دونوں کا پیار مجبور کر رہا تھا کہ کہیں سے بھی زندگی کی کرن مستعار لے کر تاریک ہوتی ہوئی چاندنی کو پھر روشن کر دیں اور چمن کے دل کے گوشے گوشے میں چاندنی بکھیر دیں۔

جب گاڑی شہاب کے بنگلے کے پورٹیکو میں ایک دھچکے کے ساتھ رُکی تو وہ خیالات کی دُنیا سے باہر آئے اور گاڑی سے نکل کر اپنے بنگلے میں داخل ہو گئے۔ سلمٰی نے انھیں دیکھتے ہی پوچھا۔

"خیریت تو ہے آج بہت دیر کر دی۔"

شہاب پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ انھوں نے سلمٰی کو جواب نہ دے کر اُسے اپنے پاس کھینچ لیا۔ سلمٰی سٹپٹا گئی اور اس نے دور ہٹتے ہوئے کہا۔

"پاگل ہو رہے ہو کیا۔ کسی نے دیکھ لیا تو؟"

"سلمٰی! آج میں پاگل ہو رہا ہوں!"

"ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"میں مر جاؤں گا جس دن یہ جان لوں گا کہ کسی نے اپنی بیوی سے اتنا پیار کیا ہے جتنا پیار میں نے تم سے کیا ہے۔ میں تمھیں اتنا پیار دینا چاہتا ہوں جتنا کسی نے کسی کو نہ دیا ہو!"

سلمٰی جو شہاب سے دور آ بیٹھی تھی کسی کے دیکھ لینے کے خوف سے بے نیاز ہو کر ایک عالم سرخوشی میں شہاب کے سینے سے لگ گئی۔ اُس کی آنکھیں سرشاری کے عالم میں بند ہو گئیں، اس کے رخسار سُرخ ہو گئے۔ شہاب نے سلمٰی کے کاندھوں کو پکڑ کر اُس کے خوب صورت چہرے کو اپنے سامنے کر لیا۔ سلمٰی کے لبوں پر ایک دلنواز تبسم کھل رہا تھا۔ شہاب کا جی چاہا وہ سلمٰی کو اسی طرح قیامت تک دیکھتا رہے!

"آج تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" سلمٰی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بتاؤں سلمٰی! ایک مریض میرے زیرِ علاج ہے، کم عمر اور نہایت ہی خوب صورت۔ وہ مائٹرل اسٹینوسس کا شکار تھی۔ اب دل نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اِس مرض کا شکار عموماً جوان اور خوب صورت لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ یہ بھی خاص بات ہے کہ یہ مرض تھوڑی دیر کیلئے مریضہ کو پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت بنا دیتا ہے۔ ایک ہلکی سی سُرخی اُس کے رُخساروں میں

عجیب سی کشش پیدا کر دیتی ہے۔ مریضہ کا شوہر ایک غریب ملازم ہے۔ وہ ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ غریب شوہر کے پاس محبت کے سوا کوئی سرمایہ نہیں۔ کاش میں ان کی محبت کو موت کے ہاتھوں سے بچا سکتا!"

"بچا لیجئے بے چاری کی جان!" سلمیٰ کے دل میں انجانی ہمدردی کروٹیں لینے لگی۔

"کاش میں ایسا کر سکتا! مجھے اُن کی محبت پر رشک آتا ہے۔ آج کچھ ایسا احساس ہونے لگا کہ میں تمہاری محبت میں اُن سے بہت پیچھے ہوں۔"

سلمیٰ مسکرا دی۔ اُس نے کہا "کسی دن گریبان پھاڑ کر نہ نکل جائیے گا ورنہ مجھے کہنا پڑے گا ع "کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو!"

شہاب ہنس پڑا۔ سلمیٰ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "میں تمہاری بے پناہ محبت کا جواب نہیں دے پاتی۔ کہیں تم اس سے تو بدگمان نہیں ہو؟"

شہاب نے سلمیٰ کے رخسار پہ ایک ہلکی سی چپت لگا دی۔

"نہیں میں سچ کہتی ہوں۔ کبھی کبھی دل میں مچلتی ہوئی آرزو کو اس لئے سُلا دیتی ہوں کہ کہیں تمہارے کاموں میں حارج نہ ہو جاؤں۔ میری محبت کی معراج میری یہ تمنا ہے کہ ایک دن تم دنیا کے عظیم ڈاکٹر بن جاؤ! جب میں اپنی اِس تمنا کی تکمیل کے لئے کوئی کوشش کرنی چاہتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے میں ایک ناکارہ شے ہوں جو تمھارے کام کبھی نہ آسکے گی۔"

"میرے لیے تمھاری مسکراہٹ ہی کافی ہے۔"

ملازمہ نے چائے لاکر رکھ دی۔ دونوں نے ساتھ چائے پی۔ شب کے کھانے کے بعد عموماً شہاب کئی گھنٹے مطالعے میں گزارتا تھا۔ وہ حسبِ معمول اپنے کام میں لگ گیا۔ دوسری صبح جب وہ اسپتال پہنچا تو سب سے پہلے چاندنی کے پاس گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ اُس کے رخساروں پہ زردی پہلے سے بھی زیادہ تھی اور آنکھیں اندر کو اور زیادہ دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اُنھوں نے چاندنی کی نبض دیکھی۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

کیا حال ہے چاندنی ؟"

چاندنی کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اس نے دوسری کروٹ لینے کی کوشش کی لیکن شہاب نے روک دیا۔

"تم اتنی اُداس کیوں ہو۔ ابھی علاج کے راستے بند نہیں ہوئے ہیں۔"

پھر بھی چاندنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نرس نے بتایا کل چمن اس کے پاس بیٹھ کر بہت رویا ہے۔ سب لوگوں نے سمجھایا لیکن وہ روتا ہی رہا۔ وہ کہتا تھا کہ چاندنی اُس سے ناراض ہے۔

"کیوں۔ کیا سچ مچ تم اُس سے ناراض ہو؟" ڈاکٹر شہاب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر! وہ بہت لُٹ چکے ہیں، ابھی اور لُٹنے کا ارادہ ہے۔ اُنھیں سمجھائیے ورنہ میرا دم نہ نکل سکے گا۔ وہ میری محبت میں ناستک ہو رہے ہیں۔ وہ میرے لئے بھگوان سے لڑیں گے۔"

"اُسے لڑنے دو۔ کبھی کبھی بھگوان اپنے بھگتوں کی لڑائی سے خوش ہوتا ہے۔ وہ ناستک نہیں ہے۔"

چاندنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر شہاب آؤٹ ڈور کی طرف روانہ ہو گئے اور مریضوں کے ہجوم میں اُلجھ گئے۔ ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ یک بیک اسپتال میں ایک شور برپا ہوا۔ سارا اسٹاف اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر شہاب کے کمرے کی طرف بھاگا آرہا تھا۔

مسز شہاب سیویر الکٹرک شاک سے بے ہوش ہو گئیں۔ ابھی ابھی اُن کے بنگلے سے ٹیلیفون ملا تھا۔ ڈاکٹر شہاب کے حواس گُم ہو گئے۔ وہ بے قراری کے عالم میں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اُن کے ساتھ ڈاکٹر رتناکر، ڈاکٹر خورشید اور ڈاکٹر ڈے بھی روانہ ہو گئے۔ پیچھے پیچھے اسپتال کی ایمبولنس بھی چل پڑی۔ آناً فاناً سارے ڈاکٹر مسز شہاب کو لےکر اسپتال واپس آگئے۔

ملازمہ نے بتایا کہ سلمیٰ چلتے ہوئے ٹیبل فین کو اپنی طرف گھمانے کی کوشش کر رہی تھیں، اُنھیں معلوم نہ تھا کہ اس پر کرنٹ ہے۔ اُس نے اس زور سے اُنھیں پھینکا کہ

سامنے کی دیوار سے اُن کا سر ٹکرا گیا اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑیں۔ ڈاکٹروں نے دیکھا تو دماغ میں انٹرنل ہیمرج ہو رہا تھا۔ سر بہت تیزی سے وَرم کر رہا تھا۔ ڈاکٹر شہاب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ تمام ڈاکٹر جی جان سے لگ گئے۔ بہترین تدبیروں کے بعد بھی سلمیٰ کو ہوش نہ آیا اور ۲۴ گھنٹے کے بعد عالمِ بے ہوشی میں ان کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔

ڈاکٹر شہاب شدّتِ ضبط سے دیوانے سے نظر آ رہے تھے۔ چمن لال اُن کی یہ حالت دیکھ کر بالکل مایوس ہو گیا۔ چاندنی کے لئے رہی سہی اُمیدیں بھی جاتی رہیں۔ چاندنی اس حادثے کی تاب نہ لا سکی۔ اُس پر نزع کی سی کیفیت طاری ہو گئی ــــ سارے ڈاکٹر اور اسٹاف کے تمام لوگ ڈاکٹر شہاب کے سامنے سر جُھکائے کھڑے تھے۔ سب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی تھیں۔ ایک شدید خاموشی نے اِس غمناک منظر کو اور بھی حسرتناک بنا دیا تھا۔ آخر کار ڈاکٹر رتناکر بڑھے اور شہاب کو مخاطب کر کے بولے۔

"اسپتال میں روز ہی ہم لوگ حادثوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہمیں ہر روز خدا کی مرضی کے سامنے جھک جانا پڑتا ہے۔ ہم ہمیشہ دوسروں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن آج ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کیا کہیں۔ ہمیں خود ضرورت ہے کہ کوئی ہمیں دلاسا دے اور ہمارے بیٹھتے ہوئے دل کو سنبھالے۔" شاید رتناکر اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتے تھے اِس لئے انھوں نے رومال سے اپنا مُنہ ڈھانک لیا۔

مریضوں کا ہجوم یہ سب دیکھ رہا تھا۔ سب کے چہرے پر رنج و غم کے گہرے آثار تھے۔ ڈاکٹر شہاب نے سب پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ رومال سے اپنے آنسو پونچھے اور ڈاکٹر رتناکر کے کاندھے کو تھپتھپایا۔ وہ بغیر کچھ کہے آپریشن تھیٹر کی طرف چل دیئے جہاں سلمیٰ کی لاش ایک چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ان کے پیچھے ہو لئے۔ شہاب نے سلمیٰ کے مُنہ پر سے چادر ہٹا دی۔ وہ جیسے گہری نیند سو رہی تھی۔ مر جانے کے بعد بھی اُس کے خوب صورت چہرے پر موت کا سایہ نظر نہ آتا تھا۔ ڈاکٹر شہاب کے دل کا جو بھی عالم رہا ہو لیکن وہ نہایت

سکون سے سلمیٰ کی ابدی نیند کو دیکھ رہے تھے۔ چند ہی لمحے بعد انھوں نے کہا۔

"چاندنی کو لاؤ۔"

ڈاکٹر سمجھ گئے۔ سب لوگ حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

ڈاکٹر خورشید نے کہا۔ "ہم سب لوگ آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن۔ . ."

"چاندنی کو فوراً لاؤ!" ڈاکٹر شہاب نے ڈاکٹر خورشید کی بات کاٹتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

چاندنی فوراً لائی گئی۔ اُس کی حالت بے حد نازک ہو چکی تھی۔ دل بدلنے کے سارے انتظامات چشم زدن میں درست ہو گئے۔ شہاب نے نشتر زنی کا آغاز کیا۔ تمام ڈاکٹر خائف تھے نفسیاتی اعتبار سے یہ ایک غلط قدم تھا لیکن اُس کے جذباتی اور ڈرامائی پس منظر میں خاموش رہنے کے سوا دوسرا چارہ کار نہ تھا۔ ڈاکٹر شہاب کے فوری عمل نے دوسرے سارے ڈاکٹروں کی ذمے داریاں اور بڑھا دیں۔ انھیں مریض سے زیادہ ڈاکٹر شہاب کو سنبھالنا مشکل نظر آرہا تھا۔ ڈاکٹر شہاب بظاہر بڑی یکسوئی اور ہوشیاری سے اپنا کام کر رہے تھے۔ لیکن بیچ بیچ میں اُن کے اوپر ہلکی سی غشی طاری ہو جاتی اور وہ خود کو سنبھالنے کے لئے ایک لمحہ کے لئے رُک جاتے اور اُن کے سب ساتھی نہایت ہوشیاری سے اُن کی مدد کرتے رہے۔ چھ گھنٹے کی مسلسل جدوجہد کے بعد ہارٹ ٹرانسپلانٹیشن کا کام مکمل ہو گیا۔ ڈاکٹر رتناکر اور ڈاکٹر خورشید چاندنی کی نگرانی پر مقرر ہوئے۔ سلمیٰ کی تجہیز و تکفین کا کام شروع ہوا۔ اُس کی لاش شہاب کے بنگلے پر لائی گئی۔ دوست، متعلقین اور دوسرے جان پہچان کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ شہاب کی حالت اب پہلے سے زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ شہاب اور سلمیٰ کے والدین بالکل خاموش تھے لیکن اُن کی دلی کیفیت شہاب سے کم خراب نہ تھی۔ آنے والوں کے لئے سخت مشکل صورت حال تھی۔ وہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ انھیں شہاب کو اس عظیم کارنامے کی مبارکباد دینی چاہئے یا اس جاں کاہ حادثے پر اظہارِ غم کرنا چاہئے۔ سلمیٰ کا جنازہ اُٹھایا گیا۔ تمام فرقے کے لوگ شہاب کے غم میں برابر کے شریک ہوئے۔ حدِ نگاہ تک غم گساروں کا

ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر سلمیٰ اور ڈاکٹر شہاب کو خراجِ عقیدت پیش کر رہا تھا۔ سلمیٰ کی تجہیز و تکفین ہو گئی لیکن شہاب کی حالت کچھ بہتر نہ ہوئی۔ اُن کا دماغی توازن بگڑتا جا رہا تھا۔ سب کے دلوں میں شہاب کے لئے تشویش بڑھ رہی تھی۔

چاندنی کو دوسرے ڈاکٹروں کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر رتنا کر اور خورشید شہاب کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ شہاب چاندنی سے ملنے کے لئے بے قرار تھے لیکن ڈاکٹروں کی رائے میں شہاب اور چاندنی کی ملاقات دونوں ہی کے لئے نقصان دہ تھی۔ شہاب اگر پورے طور پر ہوش میں ہوتے تو وہ خود بھی اس بات کو سمجھ سکتے تھے۔ لیکن ان کے اندر ایک ہسٹریائی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ بار بار اسپتال جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اُنھیں روکنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اُنھیں کئی انجکشن دیئے جا چکے تھے لیکن وہ سنبھل نہیں رہے تھے۔ بڑی کوششوں کے بعد ڈاکٹر ان پر نیند طاری کرنے میں کامیاب ہوئے۔

چاندنی ہوش میں آ چکی تھی۔ چمن لال اُس کے قریب بیٹھا تھا لیکن دونوں خاموش تھے۔ اب تک سارا اسپتال غمزدہ تھا۔

اخباروں نے بڑی بڑی سُرخیوں سے ڈاکٹر شہاب کی بے مثال قربانی کو سراہا۔ ڈاکٹر شہاب کے بنگلے پر اور اسپتال میں شہاب اور چاندنی کو دیکھنے کے لئے مشتاق لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی گیا۔ دونوں جگہ پولیس کا سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ قریب اور دُور سے خطوط، تار اور ٹیلیفون کا تانتا لگا ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ شہاب کے حواس بجا ہونے لگے اور چاندنی روز بروز صحت مند نظر آنے لگی۔ اُس کے تمام سسٹم کی سختی سے نگرانی ہوتی رہی اور مناسب دوائیں دی جاتی رہیں۔

اس طرح ڈھائی ماہ گزر گئے۔ ڈاکٹر شہاب ہوش میں آنے کے بعد قصداً اسپتال سے غیر حاضر رہے اور چاندنی سے ملاقات کی آرزو اپنے دل میں دبائے بیٹھے رہے۔ اسی طرح

چار ماہ گزر گئے۔ ڈاکٹروں نے شہاب اور چاندنی کا معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ دے دیا کہ اب دونوں کے ملنے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

ایک صبح جب چاندنی شہاب کے پاس لائی جانے والی تھی، شہاب نے اپنی ماں سے کہا۔

"ماں! اس گھر کو سجا دو۔ ویسے ہی جیسے اُس روز سجایا تھا جب سلمیٰ اس گھر میں آنے والی تھی۔ اور ماں! چاندنی کو اپنے ہاتھوں سے سنگار کر کے میرے پاس لاؤ۔ ویسا ہی سنگار کر کے جیسا سلمیٰ کا سنگار اُس دن کیا گیا تھا، جب وہ پہلی بار ہمارے گھر میں آئی تھی۔ سلمیٰ کے سارے زیورات اُسے پہنا دو۔"

ماں کی آنکھوں میں غم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن ایک قطرہ بھی چھلک کر باہر نہ آیا۔ شاید یہ عالمِ انتہائے غم تھا۔ وہ بھی چاندنی سے نہیں ملی تھی۔ اُس کے دل میں بھی چاندنی کو ایک نظر دیکھنے کی بڑی حسرت تھی۔

ماں کے حکم سے سارا گھر سجا دیا گیا اور وہ خود اسپتال چلی گئیں۔ شہاب نہایت بیتابی سے چاندنی کا منتظر تھا۔ اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ نہ وہ خوش ہی تھا نہ افسردہ ہی۔ اُس کے گھر میں دوست احباب اور رشتے داروں کا مجمع تھا۔ ساس سسر اور اُس کے والدین سب ہی ایک عجیب سے خاموش عالم میں چاندنی کے منتظر تھے۔ کچھ دیر کے بعد موٹر پورٹیکو میں رُکی۔ سب ہمہ تن انتظار ہو گئے۔ شہاب کی ماں نے چاندنی کا ہاتھ تھام کر اُسے موٹر سے اُتارا۔ چمن لال اُس کے ساتھ تھا۔

چاندنی آدھا گھونگھٹ کاڑھے ہوئے گڑیا سی بنی، بنارسی ساڑی میں ملبوس، سر سے پاؤں تک زیوروں سے آراستہ، نیچی نگاہ کئے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی شہاب کی طرف چلی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک رہے تھے۔ بابل کا گھر چھوڑ کر جانے والی سکھیوں کی طرح ڈاکٹر شہاب اس کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے۔ سب اُن کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے۔ چاندنی شہاب کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ چمن لال اُس کے پیچھے تھا۔ شہاب نے چاندنی کو یوں دیکھا

جیسے کبھی نہ دیکھا ہو۔ اُس کے گورے گورے گالوں سے شفق پھُوٹ رہی تھی۔ ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کانپ رہے تھے۔ پلکیں حیا اور دُکھ کے ملے جُلے بوجھ سے جُھکی جا رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر شہاب کچھ کہیں، چاندنی نے جھک کر شہاب کے پاؤں پکڑ لیے اور بے اختیار رونے لگی۔ شہاب نے اُس کا بازو تھام کر اُسے اُٹھایا۔ وہ روتی جا رہی تھی۔ شہاب پر ایک ہیبت ناک اضطراری کیفیت طاری تھی۔ چاندنی کو سینے سے لگا لینے کا بے قرار جذبہ اُن کے دل سے اُٹھا۔ اُنھوں نے جلدی سے چاندنی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا۔

"چمن! یہ میری سلمیٰ ہے! سلمیٰ آج سے تمھاری ہے۔ اس کا دل بہت نازک ہے۔ اس کا بہت خیال رکھنا۔ انتہائے محبت میں اسے بدگمان ہو جانے کی عادت ہے لیکن تم کبھی بدگمان نہ ہونا۔ اس سے انتظار کی گھڑیاں نہیں سہی جاتی تھیں۔ تم کبھی اس سے انتظار نہ کرانا۔ کبھی اس کے دل میں مَیں رہتا تھا لیکن اب اس کے دل میں تم ہو۔ جسے یہ دل میں رکھتی ہے اُس کے لئے بڑے بڑے خواب دیکھتی ہے۔ اس کے خواب کبھی جھوٹے نہیں ہوتے۔ کبھی اس کے خوابوں کا مذاق مت اُڑانا۔ اسے گلاب کے پھول بہت پسند ہیں۔ ہر صبح اسے گلاب کا ایک پھول چاہئے۔ وہ گلاب کا پھول اسے ہمیشہ میں دوں گا۔"

گلدان سے گلاب کا ایک پھول لے کر شہاب نے چاندنی کے خوب صورت جوڑے میں لگا دیا۔ چاندنی کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ شہاب نے اپنے ماں باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چاندنی! یہ تمھارے ساس اور سُسر ہیں۔ ان سے کہو میں تمھاری بہو ہوں ــــ سلمیٰ!"

چاندنی نے دونوں کے چرن چھوئے۔

ساس اور سُسر سے مِلاتے ہوئے شہاب نے کہا "چاندنی! یہ تمھارے ماتا اور پِتا ہیں۔ اپنی بیٹی سلمیٰ کے غم سے نِڈھال ہو رہے ہیں۔ اِن کے سینے سے لگ جاؤ اور سُنا دو کہ سلمیٰ کا دل ویسے ہی دھڑک رہا ہے جیسے پہلے دھڑکتا تھا۔ سلمیٰ مری نہیں ہے۔"

چاندنی ماں کے سینے سے لگ گئی اور دونوں بِلک بِلک کر رونے لگے۔ پھر ڈاکٹر شہاب

چمن لال سے مخاطب ہوئے اور کہا۔

"چمن لال! آج سے تم شہاب ہو اور میں چمن لال۔ تمھاری سلمیٰ زندہ ہے اور میری چاندنی مرگئی۔"

چاندنی نے ماں کے سینے سے الگ ہوکر پھر شہاب کے پاؤں پکڑ لیے اور روتے ہوئے کہا۔

"آپ دیوتا ہیں۔ دیوتا سب کے دل میں رہتے ہیں۔ آپ سدا میرے دل میں رہیں گے۔ میں ہر صبح آپ کے گلاب کے پھولوں کا انتظار کیا کروں گی!"

ڈاکٹر شہاب دم بخود کھڑے تھے۔ سب ہی رو رہے تھے۔ لیکن صرف چاندنی کے سسکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی!!

آغا سُہیل

پتنگا

جب ریل گاڑی سے اتر کر پتنگا نے چاروں طرف دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ اس نے آنکھیں بند کر کے دھند کے سمندر میں غوطہ لگایا ہو ——— کہر آلودہ آسمان، حد نگاہ تک دھند چھائی ہوئی، پرانا اکّہ اور مریل سی گھوڑی اس میں جتی ہوئی جو پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی تو اکّہ رینگتا تھا۔ اس پر بھی میر موقع دعائیں دم کر کر کے پھونکتے جاتے، چابک کیسی جس کو پھول کی چھڑی تک نہ چھوائی ہو۔ اور گھوڑی کو میری عزیز بیٹی، عزیز از جان، قرۃ العین اور عزیزہ سلمہا وغیرہ کہہ کر مخاطب کرتے ہوں، اس کی رفتار معلوم ——— اکّے کے ایک پڑکے اوپر دیوان جی بیٹھے۔ دوسرے پڑکے اُوپر ہزاری اور اندر پردے میں پتنگا ——— جس کے پیروں کے جھانجھ اور کڑے ہر ہر ہچکولے پر گھوڑی کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروں سے زیادہ شور کرتے تھے تو ہزاری کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اس نے گھوڑی کی رفتار سے اکتا کر کہا ——— "اجی میر صاحب ——— اب تو خدا کے لئے اس بار جو آٹھوں کا میلہ لگے تو اسے بیچ کر بسم اللہ کر کے دوسری ذرا شوخ سی گھوڑی خرید لیجئے۔"

میر موقع نے کان کھڑے کئے۔ "کیا کہا میاں ہزاری؟ ——— کچھ میری عزیزہ سلمہا کی نسبت تم نے رائے دی۔"

دیوان جی نے خطرے کی بو پاکر بات برابر کرنے کی کوشش کی: "نہیں قبلہ، آپ چلتے رہیئے، بھلا گھوڑی کی نسبت ایسی گستاخی کون کرسکتا ہے"۔

میر موقع اکے" سے اتر پڑے، گھوڑی کے پاس جاکر کھڑے ہو کر اس کی تھوتھنی کو سہلاتے ہوئے بولے ــــ "دیوان جی! یہ اکہ بڑی حویلی نہیں نہیں جائے گا ــــ دوسری سواری لے لیجئے ــــ آپ اتنی بڑی حویلی اور ایسی عالیشان سرکار کے دیوان ہیں، مگر بات کرنے کا ہنوز سلیقہ نہیں آیا"۔

دیوان جی نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو ہر طرف سناٹا تھا۔ درختوں کے کہرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہر دس قدم کے آگے شاہراہ تک دھند میں ڈوبی ہوئی تھی، سردی کا یہ عالم تھا کہ ذرا کان کھلے اور یخ بستہ ہوا کا جھونکا سن سے جسم کے پار ہوا۔ بدن میں لہو جما جاتا ہے، ناک برف کی قلفی کی طرح جمی ہوئی رکھی ہے۔ دیوان جی اس تصور ہی سے کانپ گئے کہ یہاں دو چار گھنٹے تنہائی میں گذار جائیں۔ جوان جہان عورت، ساتھ میں ایک نوخیز سا چھوکرا، دو بوڑھے، اگر ڈاکو آجائیں تو بھلا ہم ان کا کیا بگاڑ سکیں گے۔ جھٹ بولے ــــ "قبلہ میر صاحب، بھلا کیا قصور ہوا؟"

دیوان جی نے اتنا جو کہا تو میر صاحب چیخے: "اب قصور بھی میں ہی بتاؤں، ارے صریحاً آپ نے گھوڑی کہا اسے کہ نہیں؟ بھلا اتنی بات کی مجھے تاب کہاں۔ دیکھئے ذرا اس کی غزالی آنکھوں کی طرف، واللہ آنسو چھلک رہے ہیں ــــ آج تک اس کی آنکھوں میں نیں نے آنسو نہیں دیکھے ــــ دل ٹکڑے ہو گیا سینے میں دیوان جی ــــ سارا شہر جانتا ہے کہ کہکشاں سلمہا میری آنکھ کا تارا ہے اور اسکی نسبت آپ گھوڑی کا لفظ استعمال کریں!" پھر گھوڑی کی طرف مخاطب ہو کر اور اسکی پیشانی چوم کر بولے ــ "ہائے بیٹی کہکشاں کیا کریں، زمانہ بڑا ناقدرشناس ہے

میں تو تمھیں جوڑوں بھوڑوں میں رکھوں، کسی کی گرم نگاہ تک نہ پڑنے دوں مگر کیا کروں بیٹی پیٹ کی آگ نہیں مانتی۔"

ہزاری اور دیوان جی عجب مخمصے میں پھنسے۔ عجب خبط الحواس اکے والے سے سابقہ پڑا تھا۔ ڈالی گنج کا سنسان اسٹیشن، نہ کوئی جان نہ پہچان، دور دور تک نہ آدم نہ آدمزاد اور مزہ یہ کہ بارہ بجے دن تک کوئی گاڑی کے آنے جانے کا امکان بھی نہیں۔ چار و ناچار دیوان جی نے کہا "قبلہ بے شک مجھ سے بڑی چوک ہوئی۔ میں بحد شرمسار اور نادم ہوں ــــ لے بسم اللہ، اکہ بڑھائیے اور قصور بخشئے ــــــ"

"جی!!! میر موقع نے مڑکر کہا۔" جب تک قرۃ العین گوشہ چشم سے اشارہ نہ کرے گی میں نہیں چل سکتا ــــ اس کے مزاج کو بھلا آپ کیا جانیں اور اس کے دماغ کو بھلا کیا کوئی پہونچے۔"

ہزاری جل کے رہ گیا۔ زیر لب بولا۔ گھاس کھا گیا ہے بڈھا ــــــ

دیوان جی نے کہا۔" ایم کی بیننگ ہے۔ ایک آدھ چھینٹا تیز ہو گیا ہو گا"۔ اندر پردے میں پتنگا کی چوڑیاں جھنجھنائیں اور اتفاقیہ اسی وقت گھوڑی نے کنوتیاں بدلیں، کان کھڑے کئے اور سر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ بس میر موقع کیلئے یہ اشارہ مہمیز کا کام کر گیا۔ جھٹ اکے پر آ بیٹھے۔ بولے "چلئے اب موقع ٹھیک ہے، عزیزہ خود چلنے پر آمادہ ہے اب اس کی مرضی کے خلاف کروں گا تو اس کا دل میلا ہو گا۔"

دیوان جی اور ہزاری نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور غالباً پس پردہ پتنگا نے بھی۔ گھوڑی قدرے تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ میر موقع بولے "ماشاء اللہ ماشاء اللہ چشم بددور آج عزیزہ سلمہا شوخی کی طرف مائل ہے یا پھر

میاں ہزاری کا طعنہ تازیانے کا کام کر گیا۔ بھئی کہکشاں ہم تو قائل ہیں تمھاری غیرت اور خودداری کے ـــــ کیوں نہ ہو، ہو آخر بھلا کیسی عالی نسب والاحسب"۔ دیوان جی کیطرف مڑکر فخریہ انداز میں میر موقع نے دیکھا اور داد طلب کی۔

دیوان جی نے کہا" واہ واہ ـــــ سبحان اللہ کیا پری کی سی چال ہے"۔

ہزاری نے فقرہ جڑا" کبک دری بھی نثار ہے"۔

میر موقع پھول گئے، خوشی میں سارا غم بھول گئے، بولے" حضرت یہ بڑی عالی نسب ہے عزیزہ"۔

ہزاری بولا" بجا ارشاد ہے قبلہ، آپ سا پدر نامدار جس کی تربیت کرے کیوں نہ بھلا وہ اس بات پر فخر کرے"۔

میر موقع نے کہا" ہاں ہے تو صحیح کہ میں نے اتنی سی جان کو پالا پوسا، ہر طرح کے ناز و نعم میں رکھا۔ اچھے سے اچھا کھلایا پلایا۔ پال پوس کر جوان بھی کیا۔ مگر صاحب اس عزیزہ کا سلسلہ نسب حضرت رخشؒ تک پہونچتا ہے"۔

دیوان جی نے ذہن پر زور دے کر تمام اولیائے کرام کے اسمائے گرامی یاد کئے اور جب حضرت رخشؒ کا نام کہیں نہ ملا تو سخت مایوس ہوئے مگر ڈر کے مارے منہ سے کچھ نہ بولے کہ مبادا میر موقع کے مزاج کے خلاف گذرے۔

میر موقع دیوان جی کو خاموش پاکر بولے" قبلہ دیوان جی حضرت رخشؒ کے مزار مقدس کا پتہ اسی عزیزہ سلمہا نے معلوم کیا ہے۔ وہ جو اکھاڑہ بھیم کے پاس سے ریل کی پٹری گذرتی ہے اور ایک شکستہ سا مزار پڑا ہوا ہے وہ حضرت رخشؒ کا ہے۔ کہکشاں سلمہا ایک روز منہ اٹھائے اس طرف چلی گئی۔ میں نے بھی لگام ڈھیلی چھوڑ دی، مزار کے پاس پہونچکر رک گئی اور اشارے کر کر کے مجھے پاس بلایا ـــــ مجھ کمبخت کی سمجھ میں خاک کچھ نہ آیا ـــــ بہت پوچھا، کوئی جواب

نہ دیا۔ میں نے ہر ہر بزرگ کا نام لیا کہ یہ کس کا مزار ہے — فلاں کا ہے۔ فلاں کا ہے تو صاحب سلمہا چپ — کوئی جواب نہیں، یہاں تک کہ میں نے یہ بھی پوچھ لیا کہ کیا یہ میر تقی میر کا مزار ہے کیونکہ ایک شاعر کو میں نے اس مزار کے بارے میں یہی کہتے سنا تھا بلکہ اکثر اسے فاتحہ پڑھتے بھی دیکھا تھا۔ عزیزہ سلمہا نے اس بات پر خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا تو صاحب میں سہم گیا اور اسی وقت میں نے دل میں طے کر لیا کہ میر تقی میر کا تو یہ مزار ہرگز نہیں ہو سکتا — میں نے چپکے سے کان میں کہا۔ کیوں بیٹی تمھارے جدِّ اعلیٰ حضرت رخش کا مزارِ اقدس ہے؟ تو گردن اثبات میں ہلا دی۔ چنانچہ قبلہ ہر جمعرات کو جو آپ مزار پر ہار پھول کے انبار دیکھتے ہیں، شمع جلتی ہوئی اور لوبان سلگتا ہوا پاتے ہیں تو وہ اسی بندۂ ناچیز کا حقیر ہدیہ ہے — آپ ہی بتائیے کہ اگر رستم جیسے پہلوان کا خدا بخشے حضرت رخش ساتھ نہ دیتے تو بھلا آپ کہہ سکتے تھے رستم کو رستمِ زماں؟"

اس تقریر کے بعد دیوان جی کے ذہن میں یہ بات جمی کہ اخاّہ یہ رستم کے گھوڑے رخش کا اس اہتمام و احترام سے بیان ہو رہا تھا۔ بارے منزلِ مقصود آئی۔ ہزاری اور دیوان جی کی جان میں جان آئی — تینگا نے چادر پیچ برقع میں سے پاؤں نکال اکے کے پہیوں پر قدم جمائے، گورے گورے پیروں میں چاندی کے جھانجھ اور کڑے پڑے ہوئے تھے۔ سلمیٰ ستارے کی سرخ کامدار جوتی بہار دکھا رہی تھی۔ ہزاری ہزار جان سے ان پیروں پر عاشق ہو گیا۔ دیوان جی نے بڑھ کر سہارا دیا۔ چھم چھم کرتی ہوئی تینگا ڈیوڑھی میں آئی۔ ہزاری بچی اٹھا کر لایا۔ چادر پیچھے کی نقاب ہٹا کر بچی پر جو تینگا نے نظر ڈالی تو چاند سا مکھڑا بجلی بن کر ہزاری کے دل پر گرا۔ دھیرے سے بولا۔

"پتنگا ــــ میں ڈیوڑھی پر رہتا ہوں، روٹنے کا کام کرتا ہوں، بات بات پر باہر کے کاموں پر دوڑایا جاتا ہوں ــــ تمھارا کام بھی جی جان سے کرونگا ــــ کبھی تمھارے حکم سے باہر نہیں رہوں گا۔ آج سے سمجھ لو تمھارا کوڑیا غلام ہوں، دن میں ایک بار ضرور آیا کرنا۔"

دیوان جی پیچھے سے آگئے، بولے ــــ "جاؤ پتنگا، اندر جاؤ۔ کہہ دو دیوان جی بیگم صاحبہ کی خدمت میں کورنش بجالاتا ہے۔"

پتنگا ڈیوڑھی پھلانگ کر اندر گئی۔ صحن میں سناٹا تھا۔ غلام گردش میں کچھ ہلکی ہلکی آوازوں سے اسے اندازہ ہوا کہ کچھ نوکر جاگ اٹھے ہیں۔ محلسرا کے تمام دروازے بند۔ پردے پڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف کی غلام گردش میں بھی جاگ ہو رہی ہے لیکن دروازے ہر طرف کے بند۔ لق و دق صحن کے بیچوں بیچ بغل میں بقچی دبائے حیران پریشان دیر تک وہ کھڑی سوچتی رہی کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اونچی اونچی دیواروں کے آگے سوائے دُھندلے کہرے کے کوئی شے اب تک نظر نہیں آتی تھی۔ بڑے بڑے محراب دار دروں میں دروازے بند تھے اور شیشوں کی رنگ برنگی محرابیں دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اوپر کارنس اور چھجے اور چھجوں کے اوپر جالی اور کوٹھے کے دونوں پہلوؤں میں دو خوبصورت مہتابیاں تک دھند کی وجہ سے دھندلا گئی تھیں۔ پتنگا نے اس خوبصورت حویلی کو اپنے بچپن میں اپنی نانی کیساتھ آکر جب پہلی بار دیکھا تھا تو اس وقت بھی اس کو یہی مہتابیاں بہت بھلی معلوم ہوئی تھیں اور وہ ہمیشہ اس حویلی کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو رکھتی تھی اور آج جب اس کی یہ دلی تمنا بر آئی تھی تو وہ اس قدر خوش نہیں تھی۔ ہیضے کی وبا میں اسکے ماں، باپ، بہن بھائی اور دوسرے اعزہ نہ مرتے اور نہ اسے علاقے کے رئیس کے گھر اس طرح آکر ان کے رحم و کرم پر پڑنا پڑتا۔

آج اُسی حویلی میں اسکے آنے کی حیثیت اور تھی۔ اسی وجہ سے اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسنے نگہ اوپر اٹھاکر دل ہی دل میں کہا "پالنے والے، تیرا شکر ہے"۔ معاً پھر اس کی نگاہیں خوبصورت مہتابیوں سے ہم آغوش ہوگئیں۔ ان مہتابیوں کے ساتھ یہ حویلی کیسی خوبصورت معلوم ہوتی تھی ــــ جیسے کوئی حسینہ بسترِ ناز پر لیٹی ہو اور یہ مہتابیاں اس کے سینے کی طرح پُر شکوہ انداز میں اُوپر اٹھی ہوئی ہوں۔ ایسی بات سوچ کر اسے شرم بھی آ گئی مگر بات اتنی خوبصورت اور بھرپور تھی کہ اس کا جی خوش ہو گیا۔ اسے سچ مچ حویلی بسترِ ناز پر کسی خوابیدہ حسینہ کی طرح پڑی ہوئی نظر آئی۔

ایک غلام گردش کا دروازہ کھلا۔ نورانی چہرے والی بوڑھی آتو جی دعائے نور کا وظیفہ پڑھتی ہوئی باہر نکلیں۔ ایک سیاہ سائے کو دیکھ کر ٹھٹکیں "اُوئی کون ہے۔ تُوا۔؟" کہتی ہوئی آگے بڑھیں۔ دو تین ہیش خدمتوں نے ہڑبڑا کر دروازے کھولے اور بیک زبان بولیں "آ گئی"۔ چادروں کے بکل مار مار کر ساری جوان بوڑھی اور ادھیڑ ملازمائیں لونڈیاں ہیش خدمتیں آکر بولیں ــــ "تپنگا آگئی"۔

"اے آتو جی تپنگا آئی ہے۔ بیگم صاحبہ کو اطلاع دیجئے"۔ اور چاروں طرف سے اسے سب نے گھیر لیا۔

آتو نے پاس آکر سر سے پیر تک تپنگا کا جائزہ لیا، تپنگا بولی "بندگی"۔

آتو نے ناک بھوں چڑھائی۔ بولیں "موئے دیہاتوں میں بھلا تمیز کہاں، ادب کہاں؟ سنو بی تپنگا یہ ہے سرکار دربار کا معاملہ ــــ تمھاری گنوار دلٹھ مار بندگی یہاں نہیں چلے گی ــــ سمجھیں؟ بڑی حیثیت کے لوگ کم حیثیت کے نوکروں کو بندگی کرتے ہیں یہاں تو کورنش اور تسلیم کی خو ڈالنا پڑے گی"۔

ابھی یہ پند جاری تھا اور پند نامہ کھلا ہی ہوا تھا کہ حویلی کے ایک حصے سے ستار بجنے کی آواز دھیرے دھیرے آنے لگی اور کوئی مردانی مگر پُرسوز مترنم

آوازیں گانے لگا ــــ

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی

دوسری طرف کوئی خاتون بڑی پُرسوز آواز میں مناجات پڑھ رہی تھیں ــ

ساماں شتاب کردے میرے دل کے چین کا   پروردگار واسطہ خونِ حسینؑ کا

ایک طرف سے تسبیح و تہلیل کی صدائیں بلند تھیں۔ آسمان پر پرندے اڑتے ہوئے گذر گئے۔ گھر میں پلے ہوئے طوطے، لال مینائیں بولنے لگے، چہکنے لگے، کبوتر غٹر غوں غٹر غوں بولے اور مرغ ککڑوں کو کہہ کر چلائے۔ طوطے نے اپنا وظیفہ پڑھا۔ "مٹھو ــ مٹھو نبی جی بھیجو مدد حسین کی۔ مٹھو بیٹے خاصہ کھایا، نہیں بی بی کہاں کھایا بھوکا ہوں ــــ نبی جی بھیجو مدد حسین کی"

آسمان پر قدرے روشنی پھیلی تو تپنگا کو لے کر آ تو بڑی بیگم صاحبہ کی نماز کی چوکی کے پاس لائیں۔ بڑے دالان سے ہو کر دوسرے دالان سے گذر کر شہ نشین پر جو تختوں کا چوکا لگا تھا، نماز کی چوکی اسی پر بچھی ہوئی تھی اور بڑی بیگم صاحبہ مصلے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ تپنگا نے جھک کر کورنش عرض کی۔ اشارے سے جواب ملا۔ صحنچی میں آکر اس نے دیکھا تو چھوٹی بیگم بھی مصلے پر بیٹھی مناجات جھوم جھوم کر پڑھ رہی تھیں۔ جو دو چار لونڈیاں باندیاں اس کو اپنی ہمجولی بنانے کے خیال سے اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک نے چھوٹی بیگم کے قریب کھڑے ہو کر دھیرے سے کہا ــ "تپنگا"

چھوٹی بیگم نے اس کے سراپا کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور پھر مناجات میں لگ گئیں۔ آ تو نے کہا "جا تپنگا! کنیز جو چھوٹے نواب کی چھوچھو ہے، اسکے حجرے میں تیرا پلنگ بچھا ہوا ہے۔ وہاں جا کر بیگم صاحبہ کے حکم کا انتظار کر۔"

کنیز دوہرے بدن کی سیاہ فام نگ ہنس مکھ لڑکی تھی۔ تپنگا سر جھکائے بغل میں

بقچی دبائے جب حجرے میں داخل ہوئی تو جیسے کنیز کھل گئی۔ بقچی لے کر طاقچے پر رکھی، پلنگ درست کر کے اسے بٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرا دی۔ ہولے سے در میں لٹکے ہوئے پنجرے کی طرف دیکھ کر اشارہ کر کے بولی "دیکھ پتنگا یہ جو مینا ہے نا ـــــ اسے جب میں نے شہتوت کے درخت پر سے پکڑا اور اس پنجرے میں ڈالا تو یہ بہت پھڑپھڑائی ـــــ اب دیکھو کتنے آرام سے بیٹھی ہے"۔

پتنگا نے گہری نظروں سے کنیز کی طرف دیکھا۔ کنیز نے بے اختیار پتنگا کے گلے میں باہیں حمائل کر دیں۔ پیار بھرے لہجے میں بولی "بہن بُرا نہ ماننا ـــ ہم سب اسی مینا کی طرح کمرے میں بند ہیں"۔

پتنگا بولی "حویلی بڑی خوبصورت ہے"۔

کنیز چند لمحے تو خاموش رہی، پھر بولی "ہاں ہے تو ـــ باغ بھی بڑا اچھا ہے، آم، شریفے، امرود، بڑھل، کٹھل، شہتوت، بیر سب کچھ لگے ہیں۔ کمرک کا بھی پیڑ ہے اور پھولوں کی کیاریاں بھی ہیں۔ موتیا، بیلا، چنبیلی، جوہی، موگرا، ہار سنگھار سب اپنی اپنی فصل پر پھولتے ہیں۔ آج کل نرگس کے پھول کھل رہے ہیں۔ گل اشرفی بھی ہے۔ تمھیں کون سے پھول پسند ہیں پتنگا بہن؟ چھوٹے نواب تو بس نرگس کے پھولوں کے عاشق ہیں ـــ شاعر ہیں نا"۔

"شاعر؟ ـــ چھوٹے نواب شاعر؟ ـــ ہائے اللہ!"

"کیوں؟"

"کچھ نہیں ـــ یونہی ـــ پتہ نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ شاعر کیسے ہوتے ہیں اور شعر کسے کہتے ہیں ـــ اور اور یہ شعر ـــ ہوتے کیا ہیں"۔

"ارے تم کو یہ بھی معلوم نہیں ـــ" کنیز بولی "یہاں تو مشاعرے ہوتے ہیں۔ خیر دیکھ لینا سب کچھ۔ اور وہ ادھر جو باغ سے ملا ہوا چھوٹا سا مکان ہے

جس پر پھولوں کی بیل چڑھی ہوئی ہے، چھوٹے نواب اسی میں رہتے ہیں، بڑے نواب ادھر پہلو والے کمرے میں۔ بس ہر وقت ڈنڈ بیٹھکیں لگایا کرتے ہیں، جانتی ہو کتنا دودھ پیتے ہیں روزانہ بڑے نواب؟"

"نا۔"

"پانچ سیر، پورا پانچ ـــــ اور ڈکار تک نہیں لیتے۔ یہ اونچی چھاتی ہے اُن کی۔ سرخ رنگ، بڑی بڑی خوفناک آنکھیں۔ بولتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شیر گرج رہا ہے ـــــ صادق پہلوان کے کندھے پر بس یوں ہی ہاتھ رکھا تھا تو وہ زمین پر گر پڑا۔ جانتی ہو یہ کیتکی، چندا، زعفران مردار یں کیا کہتی ہیں ـــــ؟"

"کیا؟"

کینز نے گہری نظروں سے پتنگا کو دیکھا پھر خود بخود کھکھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھا ابھی نہیں، پھر بتاؤں گی۔"

پتنگا کو خلجان تو ہوا لیکن اصرار نہیں کر سکی، کینز کی زبان کترنی کی طرح چل رہی تھی ـــــ "اور منجھلے نواب کو تو سوائے گانے بجانے کے کچھ ہوش ہی نہیں، دن رات ستار ہے، اور وہ ہیں ـــــ سنجھلے نواب ـــــ اس نے معنی خیز انداز سے پھر پتنگا کو دیکھا ـــــ "جانتی ہو سنجھلے نواب کو؟"

پتنگا نے نفی میں زوروں سے گردن ہلائی۔ کینز نے کان کی لویں پکڑ کر کہا: "توبہ ہے ـــــ اللہ ہر بہو بیٹی کی عزت کو بچائیے! نظر کے بہت بُرے ہیں ـــــ بیگم صاحبہ نے تو ان کا محلسرا میں آنا جانا تک بند کر دیا ہے بوڑھی اور پرانی پیش خدمتوں کے سوا کوئی وہاں نہیں جاتا۔ جب بڑی بیگم صاحبہ کو سلام کرنے سنجھلے نواب آتے ہیں تو ہم سب پردے میں بٹھا دیئے جاتے ہیں اب کوئی برس دن سے تو میں بھی ان کے سامنے نہیں گئی!"

کینز نے سرگوشی میں کہا "اور موئی اس زعفران کے دیدے کا پانی ایسا ڈھلا ہے کہ روز رات کو چوری چھپے منجھلے نواب کے دیوان خانے میں چلی جاتی ہے۔ صبح تڑکے واپس آتی ہے۔ ایک دن آتو جی کی نظر پڑ گئی۔ پیٹھ پر دو ہتھڑ مار کر بولیں — " اری موئی ڈھینڈھا پھول جائے گا تو محلسرا سے نکال باہر کیجائیگی۔ جانتی ہو ڈھینڈا کسے کہتے ہیں ؟"

تینگا نے پھر بڑے زوروں سے نفی میں گردن ہلا دی تو کنیز کو ہنسی آگئی بولی "خیر سب جان لوگی، ابھی تم منہ بند کلی ہو — مگر دیکھو بوا نہ تو کبھی منجھلے نواب کیطرف جانا — اور — اور"

کنیز رُکی تو تینگا نے پوچھا "اور کدھر؟"

کنیز نے کہا "اور تہہ خانے میں بھی نہ جانا — جانتی ہو یہ جو اتنی بڑی شہ نشین اور دو بڑے بڑے دالان ہیں ان کے نیچے کیا ہے؟"

"تہہ خانہ" تینگا نے کہا "مجھے معلوم ہے میں بچپن میں ایک بار نانی کیساتھ یہاں آچکی ہوں۔ تہہ خانے میں جن رہتے ہیں نا —"

" ہائے بوا جن نہیں — ایک بامن آیا تھا۔ بتاتا تھا کہ تہہ خانے میں اشرفیوں سے بھری ہوئی سیکڑوں دیگیں چھت سے لٹک رہی ہیں — مگر ہر دیگ پر سیاہ سانپ پھن کاڑھے بیٹھا ہے۔ بامن نے کہا بیگم صاحبہ، یہ مایا آپ کو نہیں مل سکتی۔ آپ کی اولاد کو ملے گی یا اولاد کی اولاد کو —"

"ہائے میرے اللہ اگر سانپ نکل آئیں تو؟" تینگا نے کہا۔

منجھلے نواب کے دیوان خانے سے الاپ کی آواز آرہی تھی اور ستار کی لے پر اس الاپ سے عجب کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

ہلکی سی دھوپ بھی نکل آئی تھی لیکن دھند بہت دھیرے دھیرے چھٹ

رہی تھی۔ شہ نشین کی طرف سے بیگم صاحبہ کی پاٹ دار آواز سنائی دی ——
"ہرمزی خانم" (یہ آتو جی کا نام تھا) !!

"حاضر ہوئی سرکار!" ہرمزی خانم پیر میں جوتی گھسیٹتی ہوئی اندر دالان میں چلیں۔

ڈیوڑھی پہ ہزاری نے آواز دی —— "محلدار —— اے محلدار —— دیوان جی بیگم صاحبہ کو کورنش عرض کرتے ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے پاندان سے گلوری بناتے ہوئے ہرمزی خانم سے کہا۔ "پتنگا چھوٹی بیگم کی خدمت پر مامور کی جاتی ہے۔ یتیم بھی ہے یسیر بھی۔ ذرا تم سب اس کا خیال رکھنا —— دیوان جی کو ہماری بندگی کہو۔"

"بہت بہتر۔" آتو جی نے مؤدب ہو کر ایک فراشی سلام کیا۔ "بندی بھی تسلیم بجالاتی ہے۔"

بیگم صاحبہ نے کہا —" ذرا ہم پتنگا سے ملنا چاہتے ہیں — چھوٹی بیگم نے وظیفہ تمام کر لیا ہو تو انھیں بھی بلا لینا۔"

جس طرح کسی عمارت میں مینار بنا کر ادھورے چھوڑ دیئے جاتے ہیں، مہتابیوں کی شکل تو ایسی ہی تھی لیکن، حویلی کو دور سے دیکھئے تو یوں لگتا جیسے کسی پرندے نے بازو سمیٹ کر پرواز بند کر دی ہو —— ان مہتابیوں پر جو نیچے سے زینے جاتے ہیں وہ بھی میناروں کے زینوں کی طرح گردشی شکل میں بنے ہیں لیکن ان پر چڑھنے کا موقع پتنگا کو کئی روز تک نہ مل سکا۔ چھوٹی بیگم نے اسے ذرا بھی مہلت نہ دی۔ کبھی اس سے لحاف سلوائے، رضائیاں ٹھیک کروائیں، سلفچی آفتابے منجوائے، چھت گیریاں درست کروائیں، تکیوں اور تکیوں کے غلاف بدلوائے

اور جب ان سب کاموں سے فرصت ہوئی تو بدن دبوایا ـــــ اور جب رات رات گئے تک کام کرنے سے وہ چور چور ہوگئی تو پڑ کر سو گئی ۔ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا ـــــ

ایک روز صبح صبح آواز آئی ـــــ " رکاب دار حاضر ہوا ہے سرکار "
کئی بار جب رکابدار نے آواز دی اور کوئی ڈیوڑھی پر نہ گیا تو چھوٹی بیگم نے تپنگا کو دوڑایا ـــــ

" جوزیات حاضر ہیں ، حبشی بھی ہے ، جوزی بھی ، پستے کی برفی بھی ہے اور بڑی سرکار کے لئے ایک ہدیہ بھی لایا ہوں ـــــ " رکابدار نے کہا اور ایک رکابی جو بڑے اہتمام سے سجا کر لایا تھا بڑھا دی ۔ تپنگا نے ابھی رکابی تھامی بھی نہیں تھی کہ ایک ہاتھ اس کے اوپر سے آیا اور رکابی جھپٹ لی ۔ اس نے اوپر دیکھا تو ایک لحیم شحیم آدمی لنگوٹ باندھے اس کے پیچھے کھڑا حلوہ سوہن کھا رہا تھا ۔ ڈر کے مارے جو چیخ اس کے حلق تک آ گئی تھی اس کو اس نے دبا دیا ۔ سُرخ و سپید رنگت ، چوڑی چکلی چھاتی ، پتلی کمر ، بازو رانیں اور پنڈلیاں پر گوشت ، آنکھوں میں جوانی اور قوت کا خمار ـــــ بڑے نواب سچ مچ مردانہ حسن کا بہترین مرقع تھا ، دیکھتے دیکھتے رکابی خالی کر کے اس نے تپنگا کے ہاتھ پر رکھی اور یہ جا وہ جا ـــــ بیچاری تپنگا چوٹی بن کر رہ گئی ۔ کیا کرے کیا نہ کرے چار و ناچار چھوٹی بیگم سے اس نے واقعہ بیان کیا تو انھوں نے اسے خاموش رہنے کو کہا اور رکابدار کو روپے بھجوا دیئے ـــــ اسی وقت سے بڑے نواب کا ڈیل ڈول اس کے ذہن پر چھا گیا ۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مردانہ حُسن بھی کوئی شئے ہوتا ہے اور وہ اس طرح نگاہوں میں کُھب کر رہ جاتا ہے کینز اس کی دم ساز اور ہمراز تھی ، لیکن یہ راز تو اس نے کینز تک کو نہ بتایا ۔

بس دل و دماغ میں بڑے نواب کی من موہنی تصویر کو بسا کر چپ چاپ اسکی پرستش کرنے لگی۔ بڑے نواب کی ایک ہی جھلک نے اس کو ان کا والہ و شیدا بنا دیا۔ اس کو حویلی اور بھی حسین نظر آنے لگی۔

جاڑوں میں اگر جھاڑیں لگ جائیں تو سردی خوب چمکتی ہے۔ دو دن تک سورج مطلق نظر نہ آیا۔ دالانوں کے دروازے بند، پردے پڑے ہوئے، انگیٹھیاں روشن اور لوگ دبکے دبکائے لحافوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نوکر چاکر، پیش خدمتیں، لونڈیاں باندیاں سب حاضر باش حکم کے منتظر بار بار ڈیوڑھی پر ہزاری آکر آوازیں دیتا "پتنگا ——" اور پتنگا ادبدا کر ٹال ٹال جاتی کبھی کنیز کو بھیجدیتی، کبھی زعفران کو۔

چھوٹی بیگم کے بدن میں دو دن سے سخت درد تھا اور وہ صحنچی میں اپنے چھپر کھٹ پر پڑی ہوئی تھیں۔ پتنگا ان کے کمر کو لھے دبا رہی تھی۔ ایک پیش خدمت سرہانے کھڑی ہولے ہولے آگ کی انگیٹھی دھونک رہی تھی۔ دوسری دھیرے دھیرے مثنوی "زہر عشق" سنا رہی تھی۔ چھوٹی بیگم نے پان کی ایک گلوری کھا کر دھیرے سے کہا "اری پتنگا —— دیکھ یہ موا ہزاری بے طرح تیرے پیچھے پڑا ہوا ہے، بار بار تجھے جو ڈیوڑھی پر بلاتا ہے تو کہیں کوئی جادو ٹونا نہ کردے۔ تو تو ابھی پھوٹتی کونپل ہے، وہ مُردار بڑا گھاگھ ہے۔"

"چھوٹی بیگم صاحبہ —— میں اس موئے کو اپنی پتنگا کی ایڑی چوٹی پر سے سات بار واروں —— اس کے منہ کو لوکا —— اے ہے آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھے ——" آگ دھونکنے والی ملازمہ بولی۔

زہر عشق پڑھتے پڑھتے پیش خدمت رُکی اور رُک کر بیگم صاحبہ کی طرف

دیکھنے لگی۔ بیگم صاحبہ نے ایک لمحے کو پتنگا کی بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں جھانک کر کہا "ماشاء اللہ، چشم بد دور، تیری یہ بڑی بڑی آنکھیں تو بالکل آم کی پھانکیں ہیں۔"

پتنگا شرما گئی۔ ہولے سے بولی "اے ہے چھوٹی بیگم صاحبہ، کیوں بناتی ہیں مجھ نگوڑی کو ـــــ میں تو آپ کو دیکھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ یہ مردوے بھی کیسے بدنگاہ ہوتے ہیں ـــــ آخر سرکار کیا رکھا ہوتا ہے ان مُردار بازاری عورتوں میں۔ میری سمجھ تو میں خاک کچھ نہیں آتا۔ آپ کا حسن ہزاروں میں ایک ہے بی بی۔"

چھوٹی بیگم کی آنکھوں میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آنسو آ گئے اور اسی لمحے پتنگا کو یوں محسوس ہوا کہ درد جسم میں نہیں ہے دل میں ہے۔ چھوٹی بیگم کے شوہر نے ایک بازاری عورت ڈال لی تھی اور دو تین برس سے چھوٹی بیگم میکے میں آ کے پڑ رہی تھیں مگر شوہر نے پلٹ کر کروٹ تک نہ لی تھی۔ آنسو خشک کر کے بولیں "بوا یہ اپنی اپنی قسمت، جسے پی چاہیں وہی سہاگن۔" اور پھر مثنوی پڑھنے والی ملازمہ کو اشارہ کیا۔ وہ جھوم جھوم کر پڑھنے لگی ـــــ

رنگ و خوبی عطا کیا گل کو نالہ و درد بخشا بلبل کو

باہر آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے اور پانی برابر برس رہا تھا۔ ذراسی بھی دروازے کی دراز کھلتی تھی تو ہوا کا تیز جھونکا آتا تھا اور کلیجے کے پار ہو جاتا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ، شہ نشین پر آتو سے طلسم ہوشربا سُن رہی تھیں۔ ایسے میں کئی بار پتنگا کا جی چاہا ذرا بڑے نواب کو جا کر ایک نظر دیکھ آئے۔ لیکن جی مسوس کے ہوئے بس وہ چھوٹی بیگم کے کمر کو لھے دبا رہی تھی، مثنوی بدستور جاری تھی:

اس سے جس نے ذرا تپاک کیا سب سے پہلے اسے ہلاک کیا
بس میں ڈالے نہ کبر یا اس کے رحم دل میں نہیں ذرا اس کے
آتشِ ہجر سے جلاتا ہے آگ پانی میں یہ لگاتا ہے

پتنگا کا جی اُوب گیا، بادلوں کی ایسی چھت بندھ گئی تھی کہ باہر آسمان کے نیچے نکلنا محال اور اندر دالانوں میں گھس کر بیٹھنا دوبھر تھا۔ بھلا چھوٹی بیگم کی المناک زندگی سے اسے کب تک دلچسپی رہتی ـــــ بارے کینز آئی، اشارے سے اس کو آنکھ مار کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پتنگا بہانے سے اٹھی۔ اپنے حجرے میں آئی تو دیکھا کینز کے ہاتھوں میں نئی نئی چوڑیاں چمک رہی ہیں ـــــ

کینز اسے دیکھتے ہی مارے ہنسی کے دوہری ہوگئی بولی: "جانتی ہے پتنگا کون لایا؟"

"میں کیا جانوں؟"

"اری سن تو ـــــ وہ مُوا ہزاری تیرے لئے لایا تھا، میں نے کہا یہ تو میں پہنوں گی، اس کو اور لا دینا۔ بولا کینز، دیکھو یہ مذاق اچھا نہیں۔ جس کی چیز ہے اس کو ملنا چاہیئے۔ پتنگا اجازت دے تو لو ـــــ تو بھئی اب تمھاری کیا رائے ہے؟"

"بھلسا موئے کو!"

اس وقت منجھلے نواب کے مکان سے ستار پر گانے کی آواز آئی ـــــ

مہاراجا ـــــ ہوووو ـــــ کوڑیا اااا کھولو دو ووو

رس کی می ی ی بوندا پڑے ے ے ے

ارے مہاراجا ہو وووو ـــــ رس کی بوندا پڑے ے ـــــ

پتنگا کو یوں لگا جیسے بارش کی ایک ایک بوند رس میں ڈوبی ہوئی سچ مچ اس کے دل کے کواڑ پر ٹپ ٹپ کر کے گر رہی ہے اور دل کا کواڑ ہولے ہولے دھیرے دھیرے یوں کھُل رہا ہے جیسے نئی نویلی دلہن کا گھونگھٹ سرکتا ہے وقت اور سُر کا اگر سنجوگ ہو جائے تو کائنات بھی ایک نقطے پر سمٹ آتی ہے۔ منجھلے نواب کی آواز میں سچ مچ جادو تھا۔ پتنگا آنکھیں بند کر کے پلنگ پر لیٹ گئی،

اور جبتک گیت کی آواز بارش کے ملے جلے سنگیت پر اس کے کانوں سے ٹکراتی رہی وہ چپ پڑی رہی ـــــ گیت ختم ہوا تو آنکھیں کھول کر دیکھا کینز جا چکی تھی

درخت کی پتلی پتلی ڈالوں پر دھیرے دھیرے پتنگا چڑھی اور جب گھنی گھنی شاخوں میں خوب اچھی طرح چھپ گئی تو اس نے سنجھلے نواب کے صحن کی طرف نگاہ اٹھائی جہاں سنجھلے نواب گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے تھے۔ خوب بڑی بڑی مونچھوں سے ان کے چہرے سے عجیب جلال ہویدا تھا۔ انگرکھے اور چوڑی دار گھٹنے میں ان کا مضبوط جسم بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ دوست احباب جمع تھے اور رنڈی کا طائفہ حاضر تھا۔ سارنگی اور طبلے کی سنگت پر ایک نوخیز رنڈی بھاؤ بتا تا کر گا رہی تھی۔

ارے مورا سیاں، سوتن گھر نہ جا

〃 〃 〃 سوتن گھر نہ جا، بیرن گھر نہ جا

ارے مورا سیاں ـــــ

تو تو کہے موری بالی عمریا

ابھی تو ہوں لڑکیاں سوتن گھر نہ جا 〃 〃 〃

اُوپر پتنگا چڑھی ہوئی تھی اور نیچے کینز چڑھی ہوئی تھی۔ آتو کے ڈرکے مارے جلدی سے وہ نیچے اتری تو اس کی جان میں آئی۔ جلدی سے باغ کے باہر جانا چاہتی تھی کہ اس نے دیکھا چھوٹے نواب پھولوں کا گلدستہ بنا رہے ہیں اور کچھ گنگنا رہے ہیں۔ دبے پاؤں دونوں محلسرا میں آگئیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے سینوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اُسی وقت آتو کی آواز آئی ـــ "پتنگا ـــــ!"

"آئی آتو جی"۔ پتنگا کے بولنے سے پہلے ہی طوطا بولا تو پتنگا کو ہنسی آگئی۔

دو چار صلواتیں سُنانا چاہتی تھی کہ اس نے دیکھا چھوٹی بیگم نہانے کو چوکی پر بیٹھی ہیں۔ سر کے بال کھلے ہیں۔ نیچے لگن میں کھلی بھیگی ہوئی ہے اور بال دھوئے جا رہے ہیں۔ سر دُھلوا کر چھوٹی بیگم نے آنو سے کہا "آج سے حمام میں پتنگا بیٹھ دُھویا کرے گی۔ آنو جی، اب تمھارے ہاتھوں میں دَم نہیں رہا۔"

آنو نے پتنگا کو گھورا اور زبان سے کہا "بہت اچھا صاحبزادی"۔

یہ بھی پتنگا کا زندگی میں پہلا تجربہ تھا کہ اکیلے حمام میں پچیس چھبیس برس کی ایک کرڈیل جوان عورت اس کے سامنے مادر زاد ننگی کھڑی تھی جس کے سیاہ گھنے بال ٹخنوں تک لوٹ رہے تھے اور جس کا بدن کندن کی طرح دمک رہا تھا جلد کے نیچے ہلکی ہلکی آنچ سی اس کو اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پیٹھ ملتے ملتے کئی بار اس کے جی میں آئی کہ ان گداز مرمریں کمر کولھوں میں گُدگُدی کر دے لیکن چھوٹی بیگم کے مزاج سے بھی وہ واقف تھی۔ چپ چپ پیٹھ ملتی رہی —— نہا دھو کر جب چھوٹی بیگم باہر نکلیں تو عورت کے جسم کا جادو پتنگا پر منکشف ہو چکا تھا اور آج صحیح معنوں میں اس کے دل میں چھوٹی بیگم سے ہمدردی اور اُن کے بدذوق شوہر سے شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ چھوٹی بیگم بال سکھانے کیلئے اوپر کوٹھے پر چڑھ گئیں تو پتنگا بھی اوپر چلی گئی۔ چاروں طرف چھوٹے کچے پکے مکانات بنے تھے۔ جہاں غریب غربا آباد تھے۔ اُوپر کھلا ہوا وسیع آسمان تھا۔ دُور مشرق کی جانب کھیت اور باغ نظر آتے تھے۔ سڑکوں پر اکا دُکا بگھیاں، اکے، تانگے نظر آ رہے تھے۔ وہ کسی چھلاوے کیطرح دیکھتے دیکھتے مہتابی پر چڑھ گئی جہاں سے شمال کیجانب گومتی ندی واقعی گھومتی گھماتی چکر کاٹتی بہہ رہی تھی۔ جنوب کیطرف شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد نظر آتی تھی اور مغرب کی طرف سبزہ ہی سبزہ —— یہ تو دُور کے مناظر تھے۔ محلسرا سے متصل مکانات کا نظارہ بھی بخوبی ہو سکتا تھا۔

اچانک دھائیں دھائیں — دو فائر ہوئے اور برابر کی مینا بی سے شعلے نکلے پتنگا دھک سے رہ گئی۔ درختوں سے شور مچاتے ہوئے کوّے اڑ گئے اور فضا میں بو سی پھیل گئی۔

"پتنگا!" چھوٹی بیگم زینے میں آکر چیخیں۔

"جی!" سہمی ہوئی آواز میں وہ بولی۔

"نیچے آ۔"

اور وہ جب نیچے پہونچی تو اس نے دیکھا بڑے نواب انگریزی برجس پہنے گلے میں کارتوسوں کی پیٹی ڈالے، ہاتھ میں بندوق لئے کھڑے ہیں، شکار پر جانے کی تیاری ہے۔ بڑی بیگم صاحبہ کھڑی دعائیں دم کر رہی ہیں۔ آتو قرآن کھولے نواب کو گردئیں کرنے کو تیار کھڑی ہے۔ باہر تمام ملازمین حاضر ہیں۔ ہاتھی پر ہودا کسا ہوا ہے۔ ڈیوڑھی کے سامنے ہزاری دہی کی مٹکی نیک شگون کے طور پر لئے کھڑا ہے۔ نواب کا تازہ تازہ شکار ایک کبوتر تھا۔ حکم دیا گیا کہ اس کا خون نواب کے تلوؤں پر لگا دیا جائے۔ دیکھتے دیکھتے ساری پیش خدمتیں دوڑیں۔ کسی نے نواب کا جوتا اتارا، کسی نے جراب اتاری اور کسی نے ایڑی پر خون ملا۔ اور پتنگا کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکی بس ٹکٹکی باندھے نواب کو تکتی ہی رہی۔ بڑی بیگم نے چاندی کے دو روپے نواب کی مٹھیوں میں دبائے اور کہا "بیٹا یہ مستحقین کو اپنے ہاتھوں سے بانٹ دو"

نواب نے گردن کے اشارے سے پتنگا کو بلایا لیکن اس کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ چھوٹی بیگم نے کہا: "جا پتنگا لے لے!"

اور پتنگا کے ذہن میں معاً بجلی سی لہر آئی۔ بھولی بسری ایک بات یاد آئی بولی: "ہم سادات آلِ رسول ہیں، ہم پر صدقہ حرام ہے!"

نواب کا چہرہ اتر گیا۔ بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم سناٹے میں آگئیں۔ آتو کو تو وہم ستانے لگا۔ تمام نوکروں میں سرگوشیاں اور کانا پھوسیاں ہونے لگیں، نواب کا قفل دہن کھلا — "معاف کرنا سیّدانی بی — تم ہمیں دعائیں دے کر رخصت کرو۔" نواب نے یہ دیکھے بغیر کہ کون مستحق روپے لے رہا ہے مٹھیاں کھول دیں اور مبارک سلامت کی فضا میں سب نے دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں دیں۔

پتنگا نے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے کہا — "خدا حامی و ناصر!"

مکھنا ہاتھی جھومتا ہوا حویلی کے سامنے سے گذرا۔ ہر ایک شخص مکان کے چھجے کے اوپر ہاتھ اٹھا اٹھا کر خدا حافظ — خدا حافظ، اللہ بیلی، اللہ نگہبان کہہ رہا تھا اور نواب اپنے ساتھیوں کیساتھ ہودے میں بیٹھے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

ایک تپنگا کیا — سارا گھرا دُاس تھا کہ سرِشام ایک اور گل کھِلا — سنجھلے نواب ہاتھ میں بندوق لئے دندناتے ہوئے گھر میں آگھسے۔ سیدھے — بڑی بیگم کی طرف چلے گئے۔ نوکر چاکر دہل گئے۔ جس نے چیخنے چلّانے کی نیت کی نواب نے بندوق کی نالی اُسی کی طرف کر دی۔ بڑی بیگم بھی بڑے ہی دل گردے کی عورت تھیں۔ ذرا بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ بڑی دلجمعی اور اطمینان سے بیٹھی رہیں۔ نوکروں سے کہا آنے دو۔ سنجھلے نواب اپنی بڑی بڑی بھیانک مونچھوں میں مسکرائے تو پتنگا کو وہ ایک خوفناک ڈاکو نظر آئے جس کے دل میں سفاکی اور بے رحمی کوٹ کوٹ کر بھری رہتی ہے اور اس نے کبھی بار سوچا کہ وہ کچھ کرے۔ آتو پر رعشہ چھوٹا ہوا تھا۔ چھوٹی بیگم کی گھگی بندھی ہوئی تھی اور تپنگا در سے لگی کھڑی ہوئی سب کچھ دیکھ تو رہی تھی لیکن اس پر بھی خوف طاری تھا۔ کنیز نے صحنچی سے جو نکل کر یہ منظر دیکھا تو تڑ سے زمین پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ سنجھلے نواب نے بڑھ کر بندوق کی نالی بڑی بیگم کے

سینے پر رکھ دی — "او کھوسٹ!" انھوں نے اپنی ماں کو مخاطب کیا — "ساری دولت اپنے الفتوں کے کلیجے میں اتار رہی ہے — مجھے دو تین سو روپے پر ٹرخا دیتی ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ لڑکا جوان جہان ہے۔ کچھ اس کی اور بھی ضرورتیں ہیں — نکال اپنا صندوقچہ — کدھر چھپایا ہے ہیروں کو اپنے — لا نکال میرے حوالے کر —"

بڑی بیگم صاحبہ نے کہا — "او نامراد، مردود، شیطان ازلی، یزید کے ساتھی — کیا میں تیری ان گیدڑ بھبھکیوں میں آجاؤں گی — خدا تیرا منہ کالا کرے۔ دنیا و آخرت دونوں میں تو ذلیل خوار ہووے۔"

"او بڑھیا — کیوں تیری شامت گھیر رہی ہے۔" اور یہ کہہ کر سنجھلے نواب نے بیگم صاحبہ کا منہ دوپٹے سے باندھ دیا۔ پلنگ کی ادوائن کھول کر ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور تقابیے سے کنجی نکال۔ صندوق کھول کر صندوقچہ برآمد کر لیا۔ نہایت فاتحانہ انداز سے صندوقچہ لے کر وہ چلے تو تینگا چیل کی طرح جھپٹی لیکن ایک ہی لمحے میں اس کی دونوں کلائیاں سنجھلے نواب کی گرفت میں تھیں اور وہ ہس بھی نہیں سکتی تھی۔ سنجھلے نواب نے قہقہہ لگا کر کہا — "تم تو خود ہیرا ہو — کہاں چھپی تھیں؟ ہیرے جواہرات بھی ملے اور تم بھی ہاتھ لگیں۔" پھر وہ ماں سے مخاطب ہو کر بولے — "دیکھ بڑھیا یہ میرا سالانہ خراج ہے — اور یہ میری خدمت کے لئے لونڈی —"

اچانک سامنے سے منجھلے نواب ہاتھ میں ستار لئے ہوئے اور چھوٹے نواب دیوان لئے ہوئے دوڑے دوڑے آئے اور سنجھلے نواب نے قہقہہ لگایا — تینگا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ صندوقچہ بغل میں دبا کر دہوائی فائر کئے اور یہ جا وہ جا —

محلسرا میں کہرام پڑ گیا۔ بڑی بیگم صاحبہ کو سب نے کھولا تو وہ جھکوں پھکوں رو رہی تھیں اور منجھلے نواب کا منہ چھوٹے نواب اور چھوٹے نواب کا منہ منجھلے نواب تک رہے تھے۔ تپنگا اپنی کلائیوں کو سہلا رہی تھی۔ کنیز پکے فرش پر جو گری تھی تو اس کا سر کھل گیا تھا اور خون کی ایک لکیر سی فرش پر بنتی چلی گئی تھی۔ باہر سے ہزاری اور دیوان جی زوروں سے چیخ چیخ کر پوچھ رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی کہ تپنگا دوڑ کر ڈیوڑھی پر چلی گئی اور ہول جول میں یہ بھی بھول گئی کہ وہ بغیر دوپٹے کے ہزاری کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ اس نے سارا واقعہ دیوان جی کو سُنا دیا تو وہ دونوں سناٹے میں آ گئے —— دیوان جی پر یکبارگی رقت کا دورہ پڑا اور وہ چیخ چیخ کر رُونے لگے اور روتے ہوئے اندرونی ڈیوڑھی پر چلے گئے "بڑی بیگم صاحبہ۔" دیوان جی نے جھکوں پھکوں روتے ہوئے کہا۔" آج معلوم ہوا ہے کہ ہم بے والی وارث ہو گئے —— ارے اس ڈیوڑھی کو خدا سلامت رکھے —— کیسے دن آ گئے ہیں، شریف اشرف کیا کیا چلن اختیار کر رہے ہیں" ہزاری نے چپکے سے کہا ——" دیکھ تپنگا اب تیری عزت خطرے میں ہے بلی کے منہ کو خون لگ چکا ہے، اب منجھلے نواب سے آبرو بچانا مشکل ہے۔ تو میرا کہا مان۔ میرے ساتھ چلی چل۔ تیرے تلوے دھو دھو کے پیوں گا۔ اللہ کی قسم تجھے بیگموں کی طرح رکھوں گا۔"

تپنگا اپنی کلائیوں کو سہلا سہلا کر رونے لگی اور ہزاری اپنے انگوچھے سے اس کے آنسو خشک کرنے لگا جس کا تپنگا نے مطلق بُرا نہ مانا —— لیکن جب ہزاری نے بھاگ چلنے پر اصرار کیا تو اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ڈیوڑھی سے لوٹتے وقت ہزاری نے پھر کہا ——" دیکھ تپنگا بہت پچھتائے گی —— اور اپنے ساتھ میری بھی مٹی پلید کرے گی۔"

جب تپنگا وہاں سے آئی تو کنیز کے سر میں پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ آتو چھوٹی بیگم کے تلوے سہلا رہی تھیں اور زعفران کے سوا ہر ایک پریشان اور سراسیمہ نظر آتا تھا۔ چھوٹے نواب اور منجھلے نواب ابتک خاموش کھڑے تھے جیسے وہ اس حویلی کے دو عالیشان ستون ہوں اور بس۔

بڑے نواب چار پانچ روز کے بعد شکار کھیل کر واپس آئے تو سارا واقعہ ان سے چھپا ڈالا گیا سخت تاکید کر دی گئی کہ اس حادثے کی ہوا بھی نہ دی جائے ورنہ اسی گھر سے مچھاتی ہوئی کئی لاشیں نکل جائیں گی۔ بس بڑے نواب کا گھر میں — سرد مہری سے جو خیر مقدم کیا گیا تو خود ان کا ماتھا ٹھنکا۔ ماں کی علالت بھی ان کو کچھ فرضی معلوم ہوئی۔ انھوں نے منجھلے اور چھوٹے نواب سے مل کر کچھ معلوم کرنا چاہا لیکن — بے سود۔ آتو سے پوچھا تو وہاں پانچ سیر کا ان کے منہ پر قفل لٹک رہا تھا۔ بہن سے معلوم کیا لیکن ان کے جواب سے بھی تشفی نہ ہوئی۔ رات کا کھانا کھا کر جب نواب اپنے ٹھکانے پر جانے لگے تو تپنگا کے پاس اس کے حجرے میں آ گئے: "سیدانی بی"۔ بڑے نواب نے دھیرے سے کہا — "ہم تمھاری دعا سے واپس تو آ گئے لیکن ہمارے آنے سے کسی کو خوشی نہیں ہوئی۔ ہر ایک ناراض ناراض سا نظر آ رہا ہے۔ خدا معلوم کیا بات ہے جیسے کوئی بہت بڑا راز مجھ سے چھپایا جا رہا ہے — تم ایک ذرا کی ذرا اُوپر نہیں آ سکیتں؟ — میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

کسی جواب کا انتظار کئے بغیر ہی مڑے تو ایک سایہ سا دیوار کے پاس رینگا — نواب نے کہا: "کون؟" لیکن جواب ندارد — تپنگا نے بھی حجرے کے پاس آ کر دیکھا تو زعفران کے حجرے میں وہ سایہ دبک کر چلا گیا، اور جب نواب نے

زعفران کے کمرے میں جاکر لیمپ کی روشنی میں ادھر ادھر دیکھا تو ایک کونے میں زعفران دبکی ہوئی یوں بیٹھی تھی جیسے بھیگی بلی۔

تینگا نے نواب کے پاس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس کو زعفران کی سازش سے ڈر لگا۔ نواب بے خبر تھے لیکن انھیں کیا معلوم کہ زعفران کیا کر رہی تھی صرف آتو کو اور چند نوکروں کو خبر تھی۔ آتو نے بڑی بیگم کے کان بھرنا شروع کئے تو اچانک ایک دن ہزاری سے چپکے ہی چپکے دائی کو بلوایا گیا — دائی نے زعفران کو علیٰحدہ حجرے میں لے جاکر ٹٹولا تو دھک سے رہ گئی۔ ماں بننے کے آثار ظاہر تھے۔ جب دائی نے اپنا فتویٰ دے دیا تو چپکے ہی چپکے بہت سا روپیہ دے کر دائی کا منہ بند کر دیا گیا۔ بڑی بیگم نے تنہائی میں زعفران کو بلوا کر راز اگلوانا چاہا تو وہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ساری محلسرا میں ادھم تھا لیکن بڑے نواب کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی گئی۔ آتو کے ذریعہ ہزاری کو زعفران سے منسوب کرنے کے جتن ہونے لگے۔ لیکن وہ ایک ہی گھاگ تھا، سمجھ گیا۔ آتو سے کہا کہ — " بیگم صاحبہ ایسی ہی مہربان ہیں تو تینگا سے شادی کرادیں، میں راضی ہوں"۔ آتو نے کہا " تینگا سیدانی ہے اور تو ہے شیخ زادہ "۔ اور جب زعفران کے ساتھ شادی — کر لینے میں اسے بڑی چوڑی رقم کی رشوت بھی پیش کی گئی تو ہزاری بپھر کر بولا " آتو جی، تم کو تو خدا کو منہ دکھانا ہے —— ایمان سے کہہ دو اگر تمہارا بیٹا ہوتا تو تم زعفران کو اپنی بہو بنا لیتیں "۔ آتو کے منہ سے نکلا " اے نوج، ہم بی بی کا دانہ کھاتے ہیں میاں — نوابوں کا الش نہ ہم کھائیں نہ اپنی اولاد کو کھلائیں — میاں ہات بیچی ہے ذات نہیں — " یہ کہہ کر مڑیں تو دیکھا بڑے نواب کھڑے تھے۔ نواب نے آتو کو گھور کر دیکھا، پھر اُلٹے پیروں اپنی ماں کے پاس چلے گئے۔

" اماں جان مجھے سب معلوم ہو گیا "۔

اور اماں جان (بڑی بیگم) کے آنسو بہنے لگے۔ بولیں ـــ " بیٹا ـــ کیا کروں خاندان کی لاج تو رکھنا ہی ہے اس نالائق نے تو خاندان کی عزت کو بٹہ لگایا ہی ہے "

" خاندان کی لاج ؟" بڑے نواب بڑبڑائے۔" شام کو ہوا خوری کیلئے انگریزی برجس پہن کر گھوڑے پر سیر کرنے جا رہے تھے۔ ہاتھ میں تازیانہ تھا زوروں سے اپنی پنڈلی پر پٹخنے لگے۔ پھر زوروں سے آواز دی ـــ " سیدانی بی۔ سیدانی بی "

اور تپنگا لرزتی ہوئی آپہونچی۔" جی بڑے نواب "

بڑے نواب نے شہ نشین کے ایک در میں لٹکے ہوئے قرآن مجید کو جزدان سے نکال کر تپنگا کے ہاتھوں میں رکھ دیا۔" تم کو اسی کلام ربانی کی قسم ـــ میرے پیچھے یہاں جو کچھ ہوا ہے سب ابھی ابھی مجھے بتاؤ "

بیچاری تپنگا کانپ کر رہ گئی۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ہر ملازمہ اور پیش خدمت آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے منع کر رہی تھی۔ چھوٹی بیگم نے بھی آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ اس نے بڑی بیگم کی طرف دیکھا نگاہیں چار ہوئیں تو بیگم صاحبہ نے نظریں جھکا لیں۔

بڑے نواب چیخ کر بولے ـــ " سیدانی بی ـــ تمھارے جد امجد حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزیدیوں کے نرغے میں گھر کر بھی سچی بات کہی تھی، حق بات کہی تھی۔ تمھارے خاندان کا یہی شیوہ ہے کہ پھانسی کے تختے پر بھی بے باکی سے سچ اور حق بات کہہ گزرتے ہیں ـــ تم صاف صاف کہو "

تپنگا کی گردن فخر سے بلند ہو گئی۔ بڑی بیگم چھاتی کوٹ کوٹ کر رونے بلکنے اور تڑپنے لگیں۔

بڑے نواب نے کہا ـــ " اماں جان میرے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے میں اس آگ میں جلا جا رہا ہوں ـــ لیکن مجھے کوئی سچی بات نہیں بتاتا "

پتنگا بولی ــ بڑے نواب میرے سینے میں بھی سچائی کا نور اتر آیا ہے
ــــ لیجئے میں سب کچھ بتائے دیتی ہوں :

اور اس نے سارا واقعہ من وعن سنا دیا تو نواب تڑپ کر صحن میں اور صحن سے باغ کی طرف اور باغ کی دیوار پھاند کر منجھلے نواب کے مکان کے صحن میں آ گئے۔ منجھلے نواب کا گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے محلسرا میں لے آئے اور اس قدر تھپڑ، جوتے اور گھونسے مارے کہ منجھلے نواب کا نشہ ہرن ہو گیا اور سارا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ تمام عورتیں چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن کسی کا بس نہیں چلتا تھا۔ بالآخر بڑے نواب نے محلسرا کے ایک ستون میں منجھلے نواب کو باندھ دیا اور اوپر سے بھری ہوئی بندوق لے آئے۔ چاہتے تھے کہ کام تمام کر دیں کہ ماتا کی ماری ماں دوڑ کر منجھلے نواب سے چمٹ گئی۔ اس وقت وہ بڑی بیگم صاحبہ نہیں تھیں صرف ایک ماں تھیں۔

" ہٹ جائیے اماں جان! اس مردود کو جہنم واصل ہونے دیجئے ــــ اس نے خاندان ہی کی عزت کو بٹہ نہیں لگایا، انسانیت کو قتل کیا ہے ــــ یہ قاتل ہے اور قاتل کی سزا موت ہے"۔

ادھر چھوٹی بیگم بھی بڑے نواب کی بندوق پکڑے ہوئے زار و قطار رو رہی تھیں اور منجھلے نواب پھٹی پھٹی نظروں سے ہر طرف دیکھ رہا تھا۔

اللہ اللہ کر کے بڑے نواب کو ٹھنڈا کیا گیا۔ ماں نے بڑے بیٹے کے قدموں پر سر تک رکھ دیا لیکن طے یہ پایا کہ منجھلے نواب کو اسی طرح بندھا رہنے دیا جائے۔ چھوٹی بیگم نے چہرے کا لہو صاف کیا۔ بڑے نواب نے بندوق سامنے رکھ دی اور ماں کی چھاتی پر سر رکھ کر خوب روئے۔ تمام گھر میں عورتیں رونے لگیں ــــ پتنگا از راہ ہمدردی پانی کا کٹورا بھر کر منجھلے نواب کو پلانے

ے گئی ــــ سنبھلے نواب کے چہرے پر ہلکی سی خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ کٹورا لیتے وقت لبوں پر ہلکی جنبش پیدا ہوئی اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے سرگوشی میں کچھ کہا جسے سنتے ہی مَا تِینگا کٹورا پھینک کر جوتی اتار کر دھڑا دھڑ مارنے لگی۔

" کتے، ذلیل ــــ کیا سمجھا ہے تو نے؟ ــــــــ کیا مجھے زعفران سمجھا ہے تو نے؟"

تمام نوکر چاکر دوڑ پڑے، بڑے نواب بھی بپھری ہوئی تیسرنی کے تیور دیکھ کر تعجب میں پڑ گئے۔ اور ابھی سراسیمگی کم نہ ہوئی تھی کہ دھڑا دھڑ دو فائر ہوئے۔ لوگوں نے دیکھا تو بڑے نواب کی بندوق تینگا کے ہاتھ میں تھی اور سنبھلے نواب کی چھاتی سے خون کا فوّارہ اُبل رہا تھا، اور تینگا چلّا رہی تھی ــــ " میں سیدانی ہوں ــــــ میرے سینے میں سچّائی کا نور اتر آیا ہے۔"

حسین شاھد

چوبارے کی اینٹ

وہ بات بات پہ کہا کرتی "میں اینٹ تو تھی چوبارے کی لیکن لگ گئی گلی کے فرش پہ" اور لوگ بھی اس کے اس دعوے کو اتنا غلط نہیں سمجھتے تھے۔

کون کس خوبی کا مالک ہے یہ تو تبھی معلوم ہوتا ہے جب کسی سے عملاً رسم و راہ ہو لیکن بادی النظر میں جو بھی تاجاں اور بھتیجے کو ایک ساتھ دیکھتا وہ اس بات سے اتفاق کیے بغیر نہ رہتا کہ تاجاں چوبارے ہی کی اینٹ تھی لیکن بھتیجے سے اس کی شادی کا مطلب یہی تھا کہ وہ گلی کے فرش پر لگا دی گئی۔ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ رستم کو پچھاڑ دینا تو بہرحال ممکن ہے لیکن قسمت کی دیوار کو کوئی جنبش بھی دے تو کیونکر دے۔

تاجاں ایک "لُس لُس" کرتا پیکر تھی جس کا رنگ گندمی، قد لمبا، صحت مند سراپا، بھرے بھرے اعضا، اور سانپوں جیسی چال تھی۔ جو کوئی اس کے پاس سے گزر جاتا یہی محسوس کرتا کہ وہ اسوج کاتک کی شاداب مکّی کے ٹانڈے کو دیکھ کر گزرا ہے، گاؤں کے گبھرو سمجھ نہیں پاتے تھے کہ وہ اس ٹانڈے کو جڑ سے اکھیڑ کر کھا جائیں یا تمام عمر اس کی چھاؤں میں بیٹھ کر گزار دیں۔ تاجاں کا بت محوِ خرام ہوتا تو یوں لگتا جیسے حُسن اور جوانی کا سیلاب امڈا آ رہا ہے جو عقل و ایمان کو دیکھتے دیکھتے بہا کر لے جائے گا۔ اسے دیکھنے کے بعد جسے دعویٰ ہوتا کہ اس کا ایمان سلامت اور ہوش و حواس قائم ہیں اسے یہ طعنہ بھی سننا پڑتا

کہ وہ مکمل مرد نہیں ہے۔ تاجاں کے سراپا میں وہ چیز بہت کم تھی جو دیکھنے والے کو پوجا پر آمادہ کرتی ہے اس کے من میں مکمل اطمینان بھی ہوتا تو ظاہر ہے اس کا انگ انگ دیکھنے والے کو پکارتا کہ دیکھتے کیا ہو مجھے پکڑ لو! جوانوں کے اعصابی امتحان کے لئے وہ ایک چلتا پھرتا آزمائشی پرچہ تھی۔ دھان کی فصل پکنے پر آتی ہے تو دیہات کی فضا میں ایک دھیمی دھیمی سی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ تاجاں پر بھی جوانی آئی تو گاؤں کی گلیوں میں اس کے بدن کی پکار بکھرتی چلی گئی۔ اس کی برادری میں سے کئی لڑکوں نے اس پکار "میں حاضر ہوں" کا نعرہ بلند کیا لیکن نصیب سب سے زیادہ زور آور نکلے۔ تقدیر کی آندھی نے آخر کار تاجاں کے جسم کی پکار کو گلیوں سے سمیٹا اور پھجے کے گھر پھینک دیا۔ حالانکہ اگر تاجاں کا سوئمبر رچایا جاتا تو پھجا امیدواروں میں بیٹھنے کی ہمت بھی نہ کر پاتا اور پھر اس کے بعد تاجاں نے بات بات پر کہنا شروع کر دیا کہ "میں اینٹ تو تھی چوبارے کی لیکن لگ گئی گلی کے فرش پر۔۔۔"

اگر کوئی پھجے کو تنہا دیکھتا تو اسے کوئی مایوسی نہ ہوتی۔ اس کا رنگ قدرے سیاہ اور قد چھوٹا تھا لیکن لوگوں کے نزدیک یہ کوئی خامی نہیں تھی۔ لوگ کیا کہتے کہ مردوں کا حسن اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ صحت مند ہوں اور انھیں کوئی جسمانی نقص لاحق نہ ہو۔ ناک نقشے کی خوب صورتی باعث کشش ضرور ہو سکتی ہے مردانگی کا لازمی حصہ نہیں ہے اور پھر فضل دین المعروف پھجا اگرچہ خوب صورت نہیں تھا لیکن بدصورت تو اسے دشمن بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ اچھا خاصا جوان تھا اور دوسرے جوانوں میں بیٹھ کر اپنے کسی جسمانی عیب کی بنا پر منفرد نہیں ہو پاتا تھا۔ ساری گڑبڑ تو اس وقت ہوتی جب وہ اور تاجاں ایک ساتھ موجود ہوتے۔ تب پھجا اس متحرک میخانے کی دیوار سے چپکا ہوا انڈ بٹو معلوم دیتا۔ مرد ہونے کے باوجود وہ بمشکل تاجاں کے کانوں تک پہنچ پاتا اور تاجاں کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کے تمام جسمانی عیب نمایاں ہو جاتے اور وہ کسی صورت اس قابل دکھائی نہ دیتا کہ تاجاں اس کے سپرد کر دی جائے۔ اگر مقدمہ عوام کی عدالت میں پیش ہوتا تو

پھجا کبھی نہ جیت سکتا۔

اس کے باوجود پھجے میں کوئی وصف ایسا ضرور تھا کہ کچھ عرصے کے بعد تاجاں نے اس ملاپ کو من جانب اللہ قرار دیا اور آسمانی فیصلے کے سامنے جھک سی گئی۔ چوبارے کی اینٹ والا تکیہ کلام گو اب بھی موجود تھا لیکن اب ایسا کہتے ہوئے تاجاں کے لہجے میں مذاق اور پیار کا عنصر غالب رہنے لگا اور وہ پھجے کی خامیوں کو اپنی مانگ کا سیندور بنائے چلی گئی لیکن پھجے کی بزف زدہ خاموشی سے سمجھوتا کرنا اس کے لئے ناممکن ہوتا گیا۔

بات یہ تھی کہ جہاں تاجاں کے ہر موئے تن میں زبان تھی وہاں معلوم یہ ہوتا تھا کہ پھجے کے منہ تک میں زبان نام کی کوئی چیز نہیں۔ تاجاں اگر باتیں کرنے والی مشین تھی تو پھجا بے زبان جانور تھا۔ لوگ ازراہِ مذاق کہا کرتے کہ پھجا اس وقت بات کرتا ہے جب اسے امرِ ربی ہوتا ہے۔ تاجاں کے پاس باتیں کرنے اور سننے کے لئے یوں تو سارا گاؤں تھا لیکن جو پھجے کی باتوں سے بجھ سکتی تھی وہ پیاس، تو اپنی جگہ پر تھی اور پھجا تھا کہ روز بروز اس پیاس کو بڑھائے چلا جاتا تھا۔ تاجاں اسے کئی مرتبہ کہہ چکی تھی۔ "پھجے! بات کرنے میں تیرے کون سے دام اٹھتے ہیں۔ بھیڑیا پتھر بنا بیٹھا رہتا ہے، تو آزما کر دیکھ لے، اگر بات کرنے سے تیری زبان ذرہ بھر بھی گھس گئی تو میری زبان کاٹ لینا" لیکن پھجا تو اس وقت بولے جب امرِ ربی ہو۔ تاجاں دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑتی رہی لیکن دیوار گویا نہ ہوئی۔ اگر دیواریں بولنے لگ جائیں تو انسان کے آدھے دکھ ختم ہو جائیں۔

ایک دن دونوں میاں بیوی گھر میں چولھے کے پاس بیٹھے تھے۔ تاجاں کو نہ جانے کیا سوجھی، کہنے لگی۔

"پھجے ذرا اپنی زبان تو باہر نکال"

پھجا دھیمے سے مسکرایا اور خاموش رہا۔

"پھجیا! زبان نکال ورنہ میں ابھی میکے جا رہی ہوں"

چپ!

"بھتیجے زبان نہیں نکالنا چاہتا تو مجھے ابھی طلاق دے دے۔"

چپ!

"موت جو کیا! اپنی زبان باہر نکال نہیں تو یہ دیکھ میں اپنا ہاتھ جلتے ہوئے چولھے میں دے رہی ہوں۔" یہ کہہ کر تاجاں اپنا ہاتھ چولھے کے قریب لے گئی۔

"مت ماری گئی آ! لے نکالے دے رہا ہوں۔" بھتیجے نے زبان باہر نکال دی۔

تاجاں نے ایک تنکا لیا اور بھتیجے کی زبان ناپی۔ پھر اسی تنکے سے اپنی زبان ناپ کر دیکھی۔ بھتیجے کی زبان لمبی نکلی۔ تاجاں کہنے لگی۔

"شرم سے ڈوب مر۔ اگر تجھے اس بدنصیب زبان سے کوئی کام نہیں لینا تو اسے کہیں بیچ دے۔ کسی اور کے کام تو آئے گی۔ پھٹکی جو گیا! تو نے یہ گز بھر کا جھرلو اپنے دانتوں میں قید کر رکھا ہے۔ اگلے جہان پہنچ کر تجھے اس کا حساب دینا ہو گا۔"

بھتیجا کھا میں ٹھائیں ہنس دیا اور خموش ہو گیا۔ ٹین کے چھجے پر اینٹیں گر پڑیں اور پھر اچانک ان کی آواز بند ہو گئی۔

اگر بھتیجا اپنی زبان کو استعمال میں لے آتا تو ممکن تھا بات چیت کا مسئلہ تاجاں کے لئے کوئی مسئلہ نہ ہوتا لیکن بھتیجے کی خموشی نے تاجاں کے تن بدن پر قینچیاں گاڑھ دیں۔ بھتیجے کی چپ کا پلڑا جوں جوں بھاری ہوتا گیا دوسرے پلڑے میں تاجاں کی دہائی بڑھتی چلی گئی اور وہ باتوں کی لذت کے لئے وقت بے وقت گھر سے باہر رہنے لگی۔ کبھی اس گلی میں اور کبھی اس محلے میں، اگر تھوڑی دیر پہلے وہ کبھی "توت والی" کے ہاں ہوتی تو ابھی اچانک مراداں گھماری کے ہاں دیکھی جاتی۔ اگر ظہر کے وقت موچیوں کی گلی میں ملتی تو دن ڈھلے سیدوں کے محلے میں پائی جاتی۔ تاجاں باتوں کے نشے میں گاؤں کی گلیاں ناپتی رہی اور یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی کہ جو مٹیار اس طرح کوچہ گردی کرتی ہے، لوگ اسے

لگی آگ کے بجھانے کا دھوتی کار ڈ سمجھتے ہیں۔

جو لڑکی کسی دوسرے گاؤں میں بیاہی جائے وہ شادی کے تھوڑا عرصہ بعد ہی ان لڑکوں کے لئے بھی بہن کے ہم پلہ ہو جاتی ہے جنہوں نے اسے کنوار پنے میں بری نیت سے دیکھا ہو لیکن تاجاں ایک تو بیاہی بھی گاؤں کے اندر گئی دوسرے شادی کے بعد جو زنجیر لڑکی کے پاؤں میں از خود پڑ جاتی ہے وہ پھجے کی خموشی نے توڑ دی اور تیسرے اپنی لاابالی طبیعت کے ہاتھوں وہ گاؤں کے جوانوں کے لئے بہن کے درجے تک نہ پہنچ سکی۔ لڑکے گلیوں کی نکڑوں پر کھڑے رہتے اور جب تاجاں ان کے پاس سے گزرتی تو کسی نہ کسی بہانے اسے بلانے کی کوشش کرتے۔ پھجے کی خموشی کی ماری ہوئی تاجاں ہر کسی سے بلا جھجک باتیں کرنے لگتی۔ اندر سے کوئی طاقت ہر وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتی رہتی جس پر تاجاں کا اپنا کوئی اختیار نہ تھا اور پھر چلتے وقت اپنے آپ کو سنبھال کر چلنے کی وہ شروع ہی سے عادی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر لڑکا گلی کے موڑ پر یہی سمجھتا تھا کہ تاجاں اس کی مٹھی میں ہے اور وہ جب چاہے یہ خربوزہ نگل سکتا ہے لیکن جس لڑکے نے بھی تاجاں کو تنہا پاکر خربوزہ نگلنا چاہا اسے معلوم ہوا کہ وہ تو نیم کی شاخ ہے۔ چنانچہ جس جس لڑکے کو بھی آزمانے کا موقع ملا وہ اس خوش فہمی سے نکلتا گیا کہ تاجاں آسانی سے ہاتھ آجانے والی چیز ہے لیکن کسی نے بھی یہ راز دوسرے پر نہ کھولا۔ سب اندر ہی اندر دانت پیس کر رہ گئے۔

ایک دن نمبرداروں کے کھیت میں کماد چھیلا جا رہا تھا۔ ایک ڈھیر پر حیات چھینبا، نذیر گورایا، عبدل جھٹ اور نورا ارائیں بیٹھے کماد چھیل رہے تھے دیکھتے کیا ہیں کہ پاس سے تاجاں گزری جا رہی ہے۔ یہ چاروں اپنی اپنی جگہ نیم خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ تاجاں کو اتنا قریب دیکھا تو ہر ایک کو پوری پوری بوتل کا نشہ سوار ہو گیا ـــ ایسا قصور لڑکوں کا کبھی نہیں تھا۔ اگر تاجاں کو قدِ آدم شیشہ میسر ہوتا اور وہ اپنے آپ کو چلتے ہوئے اس میں دیکھ لیتی تو ممکن تھا وہ اپنی گِرم گِرم کر سنبھلتی جوانی کو قابو میں رکھ سکتی۔ لیکن وہ تو جب محو خرام ہوتی تو پینگ کا

ہلورہ بن جاتی۔ اسے یہ خیال تک نہ ہوتا کہ جوانوں کو آزمانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب پینگ کا ہلورہ لڑکوں کی سمت میں آیا تو عبدل سے رہا نہ گیا۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ تاجاں کو نہیں دیکھ رہا عبدل نے تیزی سے درانتی گنے پر چلانا شروع کی اور ساتھ ہی گانے کا بول اُٹھایا۔

گُڑ کھاندی تے نالے گنے چوپدی آئی آئی جوانی شُوکدی

بول کا سرا باقی لڑکوں نے پکڑ لیا اور کورس گانے لگے۔ تاجاں کے پاؤں غیر ارادی طور پر تھم گئے اور ساتھ ہی لڑکے بھی خاموش ہو گئے۔ تاجاں یہ کہتے ہوئے پھر چل پڑی۔

"جن کے گھر میں مائیں بہنیں ہوں وہ اس طرح نہیں کرتے۔"

"اوہ! تاجاں تم تھیں؟ نال ایمان دے ہم نے نہیں دیکھا۔" عبدل نے تاجاں کو براہِ راست مخاطب کیا۔ اس پر تاجاں نے دیکھا کہ باقی لڑکوں کی باچھوں سے ہنسی کھسکنے لگی ہے۔ تاجاں بھڑوں کے چھتے کی طرح عبدل پر ٹوٹ پڑی۔

"اگر تم اندھے ہو تو میں ابھی بھیجے کو بھیجتی ہوں وہ تمہاری آنکھیں درست کر دے گا۔"

ہنسی لڑکوں کی باچھوں میں تڑپ کر رہ گئی!

ایک غیر متوقع منظر میں گھر جانے پر عبدل حواس باختہ سا ہو گیا اور تقدیر کے تیر کی طرح اس کے منہ سے نکل گیا۔

"بھیجے کو بھیجنے کی کیا ضرورت ہے، مار ڈالنے کے لئے تم کیا کم ہو۔"

پھر کیا تھا۔ تاجاں کا جلالی روپ بروئے کار آگیا اور وہ عبدل پر گالیوں کی یلغار کرتی ہوئی اس کی سات پشتوں کے مورچے روندتی چلی گئی۔ عبدل کے لئے اس منظر میں کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ پڑے اور وہ اس میں سما جائے یا آسمان اسے اوپر اُٹھا لے۔ اگر نمبرداروں کا مراد موقع پر نہ پہنچ جاتا تو تاجاں عبدل کی ماں بہن کو نہ جانے کس کس سے منسوب کرتی لیکن مراد نے جلد ہی بات سمیٹ لی۔

مراد ایف اے تک تعلیم یافتہ تھا اور پنجابی فلمیں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ اس کے دل میں

پنجابی فلموں کا ہیرو بننے کی پرانی کسک تھی اور آج اسے شوٹنگ میں حصہ لینے کا موقع مل گیا تھا جس کا اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اداکاری کے لئے سیٹ تیار تھا۔ مراد نے دو تین او۔ کے (O.K) شاٹ دیئے۔ ایک طرف تاجاں سے ہمدردی جتائی دوسری طرف عبدل کو لعن طعن کی، عورتوں کی عزت کے بارے میں ایک دو مکالمے دہرائے اور سر کو جھٹکانے کر عبدل پہ چل پڑنے کا انداز اختیار کیا۔ اگر عبدل غلطی پہ نہ ہوتا تو مراد کی ساری ایکٹنگ نکال دیتا لیکن منظر ہی کچھ ایسا بن گیا کہ کاشت اور آبپاشی کے تمام دکھ تو عبدل نے سہے اور فصل مراد نے کاٹ لی۔

مراد کی اداکاری کا تاجاں پر غصے کے عالم میں جو اثر ہوا وہ اسے محسوس نہ کر سکی۔ البتہ رات کو سوتے میں وہ تمام رات گلی کے فرش پر گرتی رہی اور مراد اسے بازوؤں میں سنبھال کر چوبارے کی طرف کھینچتا رہا۔ دن چڑھنے تک تاجاں کو وہم پڑ چکا تھا اور وہ جس چوبارے کی اینٹ تھی وہ چوبارہ خود چل کر اس کے پاس آگیا ہے۔

ادھر مراد بھی اپنی کل والی اداکاری کا اثر دیکھنے کے لئے بار بار تاجاں کے گھر کی طرف سے گزرتا رہا۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر چوبارہ کھانستا تو اینٹ کھسک کر دروازے میں آجاتی۔ شام تک چوبارہ بھی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ یہ اینٹ میرے ساتھ ــــ ہوگی تو قائم رہوں گا نہیں تو دھڑام سے نیچے آرہوں گا۔

تاجاں اپنے آپ کو چوبارے کی اینٹ سمجھتی تھی اور چوبارہ خود اس کے قدموں میں آرہا تھا۔ مراد کے جسم میں فلمی ہیرو رچا ہوا تھا اور وہ ہر وقت ہیرو دل لے کر سب دکھانے کے لئے بے چین رہتا تھا اور اب کرتب دکھانے کے لئے لگا لگایا سیٹ تیار تھا۔ دونوں اپنی اپنی غرض کا شکار تھے۔ مراد رومانی ڈائیلاگ بولتا رہا اور تاجاں ہواؤں میں اڑتی رہی۔ فرش کی اینٹ اچھل اچھل کر چوبارے سے ٹکراتی رہی۔ اب وہ چوبارے میں نصب ہو جانا چاہتی تھی لیکن سارا گاؤں ان کے لئے دلن کا روپ اختیار

کرتا گیا۔ دونوں نے مل کر کہانی مکمل کر دی اور ایک دن گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کو اطلاع دے رہے تھے۔

"مرادتے تاجاں نس گئے نیں!"

ایک ماہ کے قریب گزر گیا۔ کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ مراد اور تاجاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ لوگ قیاس آرائیاں کر کے خاموش ہو گئے۔ کچھ ہمدردوں نے پھجے کو اغوا کا کیس درج کرانے کا مشورہ دیا لیکن وہ تو یوں خاموش تھا جیسے اس نے زبان بے زبانی کو وکیل کر رکھا ہو۔ ایک مہینے کے بعد ہوا بھی یہی۔ گویا پھجے کی خاموشی نے مقدمہ جیت لیا ہو۔ تاجاں مراد کے ساتھ صرف ایک مہینہ گزار سکی۔

ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا پھجے کے دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی۔ پھجے نے دروازہ کھولا تو سامنے چوبارے کی اینٹ سرنگوں کھڑی تھی۔ وہ تڑپ کر اندر آئی اور پھجے کے پاؤں میں گر پڑی اور رو رو کر اس سے معافی مانگنے لگی۔ تاجاں کو اصرار تھا کہ پھجا اپنی زبان سے اسے معاف کر دینے کا اعلان کرے لیکن پھجے کی چپ کا تالا نہ کھلا نہ ٹوٹا تاجاں بول بول کر پاگل ہو گئی۔ آخر کار اس نے سراپا التجا بن کر کہا: "پھجیا! اگر تو مجھے معاف نہیں بھی کرنا چاہتا تو کم از کم بتا ہی دے۔ خدا کے لئے کچھ تو بول۔ لیکن نہ اصرار بّی ہوا اور نہ پھجے نے بات کی۔ تاجاں خدا سے بھی دل ہی دل میں دعا کر رہی کہ الٰہی ــ! ایک مرتبہ اس بے زبان کو زبان دے تاکہ یہ میری بات کا جواب دے سکے۔ کہیں سحری کے وقت تاجاں کی دعا قبول ہوئی اور پھجے نے جواب دیا۔

"جامیں نے تجھے معاف کیا" رات کا باقی حصہ پھجے نے پھر کوئی بات نہ کی۔

پھجے کے معاف کر دینے کی دیر تھی کہ تاجاں کو یوں لگا جیسے وہ اپنی پرانی جگہ پر سیمنٹ سے فٹ ہو گئی ہے۔ پھجے کے ایک جملے نے اس کے پاؤں یوں مضبوط کر دیئے جیسے وہ کبھی اکھڑی ہی نہ تھی۔ دن چڑھنے پر وہ لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں

باتیں کرنے لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بلکہ اگر کوئی اس کے اغوا کی بات چھیڑتا تو تاجاں کے ہاتھوں اچھی خاصی بے عزتی کر ڈالیتا۔ چند روز گاؤں میں بھانت بھانت کی بولیاں سُنی گئیں۔ کسی نے کہا بھیجے نے اس پلید عورت کو گھر میں کیوں ڈال لیا۔ کسی نے گھریلو زندگی کی تباہی کے نام پر بھیجے کے اس عمل کو جائز قرار دیا۔ کچھ عرصہ یہ مخالف اور موافق بحثیں اُبلتے ہوئے پانی کی طرح آپس میں اُلجھتی رہیں۔ پھر وقت نے آہستہ آہستہ نیچے سے ایندھن کھینچ لیا اور پانی ٹھنڈا ہو کر ساکن ہو گیا۔

ٹھنڈے دنوں میں ایک دن ـــــ جب تاجاں اور رکھی توت والی تھلا بیٹھی تھیں، رکھی نے بڑے رازدارانہ لہجے میں تاجاں سے پوچھ ہی لیا۔ "نی! تو نے باؤ مراد کو کیوں چھوڑ دیا؟" تاجاں ڈھیلی پڑ گئی اور کہنے لگی۔

"تم تو ٹھہری میری بہن، تم کون سا کسی سے بات کرو گی۔ اندر آؤ میں تمہیں تمہارے سوال کا جواب دوں۔"

یہ کہہ کر تاجاں رکھی کو کھینچتی ہوئی اندر لے گئی۔

جب وہ دونوں اندر جا کر ایک دوسری کے سامنے کھڑی ہوئیں تو ان کے دل یوں دھڑک رہے تھے جیسے دونوں کے درمیان کوئی مرد کھڑا ہو۔ تاجاں نے مضطرب سانسوں اور لڑکھڑائے لفظوں میں باؤ مراد اور بھیجے کا موازنہ کیا اور رکھی کو بتایا کہ اب وہ ذوقِ نظر کے چوبارے سے تسکینِ قلب کی گلی میں اُتر آئی ہے۔

"ہائے ری!" رکھی نے تاجاں کے سینے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور تاجاں کی بات کا مزہ لیتی ہوئی باہر کو بھاگ گئی۔

اور پھر اس کے بعد تاجاں کے منہ سے یہ بات کسی نے نہ سُنی کہ وہ اینٹ تو تھی چوبارے کی لیکن لگ گئی گلی کے فرش پہ۔

فرخندہ لودھی

حرامی

اس کا نام نفرت سے بگاڑا گیا نہ پیار سے۔ بچپن سے جوانی تک عالم ہی رہا۔ اس کو عالم فاضل اور مہذب دیکھنے کے شوق میں ماں کی آنکھیں چندھیا گئیں پر عالم کو جو بننا تھا بن گیا۔

اسے جوانی کا احساس کچھ یوں ہوا جیسے کچی اور سوکھی لکڑی میں گھن پیدا ہو جائے آپ ہی آپ۔ فکریں دو چند ہو گئی تھیں اور ماں کہتی تھی جس کا پڑھا لکھا جوان بیٹا ہو اُسے کس چیز کی کمی۔ بہنیں آس پر آس لگائے بیٹھی تھیں۔ اُن کے آنچلوں کے نیچے ڈھکے ہوئے سر کب سفید ہوئے اور یہ جھکی جھکی آنکھوں کے گرد کب جھرّیاں نمودار ہوئیں اُسے پتہ نہ تھا۔ اُس کے پاس کتابوں کا علم تھا اور ایک بھاری ڈگری۔

عالم کو اس ڈگری میں قطعی دلچسپی نہ تھی ہاں ماں اک اک سے اُس کا ذکر کرتی اور فخر سے اس کا سر اٹھ جاتا اور پیلی اُداس آنکھیں پھیل جاتیں جیسے یہ ڈگری خود اس نے حاصل کی ہو۔

گھر پر ہمیشہ اداسی اور تناؤ کی کیفیت چھائی رہتی۔ بہتر زندگی کی خواہش کے کرب میں مبتلا گھر کا ہر شخص خاموش اور مایوس رہتا۔ اپنی اپنی ذات میں گُم۔ اُن کی زندگیاں جوہڑ کی سی تھیں۔ ندی نالوں کا بہاؤ ان میں نہ تھا۔ عالم کو تعلیم مکمل کر چکنے کے بعد اپنی ذات پر اعتماد ہونے کے بجائے ناامیدی ہوئی۔ کیا خوب کہ وہ پتھر کا ایک حقیر ٹکڑا ہوتا، شعور اور

آگہی سے بے بہرہ۔ یوں پڑھ لکھ کر حساس طبیعت ڈرپوک ہو کر رہ گئی تھی۔
دوست اور عزیز الگ یاددہانی کراتے رہتے۔
"میاں بڑی سی نوکری کر لو۔ کیا جھک مارتے ہو"۔
میاں عالم اس حقیقت کو جانتے تھے کہ غیرت مندی کے ساتھ ایک لقمے تک ہاتھ پہونچنا کتنا مشکل ہے۔ بڑی نوکری بہرکیف ستاروں پر کمند ڈالنے سے کم نہیں۔ ستاروں پر ہر شخص کمند نہیں ڈال سکتا۔ فقط دیکھ کر آنکھیں خیرہ کر سکتا ہے۔

صبح اس کا انٹرویو ہونے والا تھا۔ وہ لالٹین کی پیلی روشنی کے سامنے کاغذات پر جھکا ہوا جانے کیا پڑھ رہا تھا اور کیا سمجھ رہا تھا۔ پاس کی چارپائی پر ماں لیٹی ہوئی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔
"ماں تم کیا پڑھ رہی ہو؟" اُس نے بلا مقصد ماں سے پوچھا۔
"میں تمھاری کامیابی کی دعا مانگ رہی ہوں"۔
"آہا — ہا — ہا"۔
وہ ہنسا اور اپنی کرالین کی قمیص اتارتے ہوئے بولا —
"ماں! یہ دھلوا دو۔ صبح تک سوکھ جائے گی۔ اچھے کپڑے کا دیکھنے والے پر اچھا اثر پڑتا ہے"۔
چند لمحوں بعد ماں قمیص دھولائی اور الگنی پر پھیلانے کے بعد چپ چاپ کروٹ بدل کر بظاہر سو گئی۔ صبح اس کے بیٹے کا انٹرویو تھا۔ اور اس کا جی عجیب سا ہو رہا تھا۔
عالم کی نظر ماں کی مندی ہوئی آنکھوں پر اچانک پڑی۔ سیاہ گڑھے دھندلی روشنی میں تاریک اور عمیق تر نظر آتے تھے۔
"میری اچھی ماں! تو میرے لئے دعا مانگتی ہے — دنیا میں کون ما سکتہ

چلتا ہے، میں نہیں جانتا اس لئے کہ تو نہیں جانتی تھی تو نے ہمیں کھرا کرنے کی کوشش میں کھوٹا بنا دیا ـــــ ماں! تم عجیب ماں ہو ـــــ بالکل بیکار ـــــ" وہ قدرے بلند آواز سے بولا۔

ماں نے پوچھا تو وہ کچھ بھی نہ بتا سکا۔ محبت اور احترام کے مارے اس کے اعصاب ساز کے تاروں کی طرح بج اُٹھے۔ ماں کہہ رہی تھی ـــــ

"تو بھی سو جا بیٹے۔ دیر سے سوؤ گے تو دیر سے آنکھ کھلے گی۔"

وہ بتی گُل کر کے نیند کا انتظار کرنے لگا۔

موسم بہار کے دن تھے۔ عالم کو بستر میں گرمی لگ رہی تھی۔ رات کی گمبھیرتا روبہ زوال تھی۔ ساتھ پڑی چارپائی چرچرائی۔ عالم نے سانس روک لی۔ پھر ہلکی سُرسُراہٹ اور بھنبھناہٹ ہوئی۔ جیسے تتلی پھول کی پتی کو چوم رہی ہو۔ یا شہد کی مکھی شہد کی تلاش میں گھوم رہی ہو۔

عالم نے ماچس جلائی اور دیکھا۔ ماں تکئے پر اوندھی گری کچھ بول رہی ہے۔

"ماں ـــــ" اُس نے تڑپ کر پکارا۔

"میں تمھارے لئے دعا مانگ رہی تھی۔ سُنا ہے دعائے نیم شبی میں بڑا اثر ہے۔"

"ماں! تو کتنی پیاری ہے!" وہ ماں کے ساتھ لپٹ کر بچوں کی طرح ایک ہی فقرہ دہراتا رہا۔

بہار کے دن اسی طرح آ کر گزرتے رہے تھے۔ عالم کو کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔

رنگ و بو سے رچے ہوئے مہینوں میں ہمیشہ امتحانات ہوتے۔ کھلے موسم کی البیلی ہوا پھولوں کی متوالی مہک۔ وہ جھینگا سی چارپائی پر کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے، کتاب کھولے،

نتھنے پھیلا دیتا، نظریں ڈھلے ہوئے آسمان پر دُور دُور چیلوں کی اڑان کا تعاقب کرتیں تو ماں سرزنش کرتی۔

"پڑھائی کی طرف خاک دھیان نہیں ـــــ"

وہ ہر سرزنش کے بعد حواس مجتمع کر کے کتاب کی طرف متوجہ ہو جاتا، گلیارے میں دھول دھپا کرتے، کمسن چھوکروں کی آوازیں ہوا کے دوش پر اڑتیں اُس کے کانوں کے ذریعہ دل سے ٹکراتیں اور وہ سوچتا۔

یاری اور رشیدا دوسرے لڑکوں کے ساتھ بھینسیں چرانے جا چکے ہونگے ـــــ یہ لڑکے خوش نصیب ہیں۔

چند سال پہلے عالم کو اسکول جاتے دیکھ کر یاری کی ماں بھی بیٹے کو اسکول چھوڑ آئی تھی تو یاری کے گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ بھلا پڑھائی میں دل اور دماغ کھونے سے فائدہ؟ پڑھ لکھ کر تو انسان بزدل ہو جاتا ہے۔ جی جان سے چلا جاتا ہے۔ یاری کا باپ بیوی پر بہت خفا ہوا۔ وہ آٹے دال کی دوکان کرتا تھا کئی تعلیم یافتہ کلرکوں کو اُدھار سودا دے کر پچھتا رہا تھا۔ وہ اس سے کترا کر نکل جاتے اور مہینوں قرض ادا نہ کرتے۔ اسے پڑھے لکھے لوگوں کے بارے میں تلخ تجربہ تھا۔

اس جھگڑے کے بعد یاری اور عالم کا میل جول کم ہو گیا۔

اس کے برعکس عالم کے ابا کا خیال تھا کہ علم حیوان کو انسان بنا دیتا ہے اور کتاب سے بہتر کوئی دوست نہیں۔

عالم کبھی کبھا، چوری چوری گلی کے بچوں سے مِل کر کھیل لیتا اور گھر آ کر خوف سے کانپتا رہتا۔ کہیں ماں نے دیکھ نہ لیا ہو۔ بڑی بہن نے شکایت نہ لگا دی ہو۔ وہ تو شکر کہ ابا زیادہ وقت گھر سے باہر رہتے تھے۔ خاکسار پارٹی میں شامل ہو کر خاک ہو گئے تھے۔ گھرداری کا تمام بوجھ ماں کے کمزور کندھوں پر تھا۔

وہ انہماک سے مطالعے میں مصروف تھا۔ گلی میں کھڑے یاری نے مخصوص سیٹی بجائی۔ وہ کتاب بند کر کے کھسکنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ باورچی خانے سے ماں کی آواز آئی۔

"کیا بات ہے؟ کہاں جاتے ہو؟"

پھر وہ چیختی چلاتی باہر کے دروازے کی طرف لپکی اور ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر یاری کو دو چار گرم گرم سنائیں۔

اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی یاری کی ماں نے سنا تو گویا پٹرول نے شعلہ دیکھ لیا۔ اُسے گلی میں کھڑے ہو کر لڑنے کی بڑی مہارت تھی۔ وہ گالیوں طعنوں کی تال پہ ہاتھ نچاتی، کلاسیکی رقص کے بھاؤ بتا رہی تھی اور عالم نے دیکھا کہ اس کی ماں پردے سے الجھتی ہانپ رہی ہے اور اس کے سفید بال چہرے پر بکھر گئے۔ وہ کیا کہہ رہی ہے سنائی نہیں دیتا۔ اور گلی میں یاری کی ماں کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اس لمحے عالم کو ماں پہ غصّہ آیا اور رحم بھی۔ پھر وہ اُسے گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی۔ تڑاخ تڑاخ کئی طمانچے اُسکے منہ پر برسے۔

"جاہل حرامی چھوکروں کے ساتھ کھیلے گا ـــــ"

دونوں بہنیں سہمی ہوئی اسے پٹتے ہوئے دیکھتی رہیں ـــــ اُف وہ کس قدر بے حس تھیں عالم کو ان سے سخت نفرت محسوس ہوئی۔ اس پر تنہائی اور کسمپرسی کا احساس غالب تھا۔

پٹائی کے بعد ماں کچھ دیر ہانپتی کانپتی بیٹھی رہی۔ پھر نہ معلوم کیا ہوا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اونھ ـــــ"

عالم کے جی میں قطعی ہمدردی نہ تھی۔ ماں کو روتا دیکھ کر بہنوں نے منہ بسور لئے اور وہ نہایت سلیقہ کے ساتھ آنسو پونچھتی رہی۔ یوں سوسائٹی کے مہذّب افراد کا غصّہ،

نفرت، بغاوت، آنسوؤں کی صورت میں بہتا رہا۔ تہذیب نہ کھل کر رونے دیتی ہے نہ ہنسنے۔
رات کو ابا واپس آئے تو انھوں نے اسے پیار کیا نہ ماں کو شاباشی دی، بس ناراض ہوتے رہے۔

ہمسائے میں کوئی تقریب تھی۔ لڑکیوں کے گانے اور ڈھولک کی آواز لیموں اور مالٹے کے پھولوں کی خوشبو کے ساتھ مل کر دھوم مچاتی پھرتی تھی۔ وہ ریاضی کے سوالات حل کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ دوسرے دن پرچہ تھا۔ ابا حقہ گڑگڑاتے اونگھ رہے تھے۔ بہنیں دم سادھے لیٹی تھیں جیسے اوائل عمر کی میٹھی نیند میں ہوں۔ ماں اس کے پاس بیٹھی سوت اٹیر رہی تھی۔ رات بھیگی تو ڈھولک کی دھم دھم زیادہ واضح ہو گئی۔

"ہائے ہائے لوگوں کو شادی بیاہ کے سوا کچھ سوجھتا بھی ہے۔"

عالم نے بیزار ہوتے ہوئے کہا اور کتاب بند کر دی۔

لیکن ایک خیال اسے بار بار آتا رہا۔ ان کے گھر میں اتنا ٹھہراؤ اور اتنی اُداسی کیوں ہے؟ نہ کسی کا بیاہ ہوتا ہے نہ کوئی نیا فرد آتا ہے اور ماں ہر وقت کھتی رہتی ہے۔

"اچھا وقت آئیگا۔ ہم کوئی ایرے غیرے تو نہیں کہ معمولی معمولی خوشیوں پر جی پھینکتے رہیں۔"

عالم جوں جوں بڑا ہوتا گیا اسے اپنے گھر کی عسرت کا خیال ستانے لگا۔ ابا اس کی جوانی پر آس لگائے بیٹھے تھے ـــ بڑا ہو کر سب کچھ کر لے گا ـــ تنخواہ لا کر بیوی کے ہاتھ میں دیدی اللہ اللہ خیر سلا۔ وہ جانے اس کا کام۔ ماں کو اپنے دکھوں کا مداوا عالم ہی میں نظر آتا تھا۔

یاری کی بہنوں کی ایک ایک کر کے شادیاں ہو چکی تھیں۔ اب وہ جب کبھی میکے آتیں تو بھینسوں کے گوبر تھاپنے کے بجائے اپنے بچوں کا گو، موت دھوتی نظر آتیں۔ وہ کیسی تندرست خوش و خرم تھیں اور کیسی صحت مند ـــ کبھی چھت پر بیٹھے بیٹھے کتاب سے تھکتی نظریں یاری کے صحن میں جا پڑتیں تو عالم کو ایسے محسوس ہوتا کہ بھینسوں کے گوبر کی بو کے ساتھ تندرست

بدنوں کی باس گڈمڈ ہو رہی ہے اور تفکرات میں اُلجھے ہوئے ذہن میں ایک احساس سر اُٹھاتا ہے اور اُسے جھٹکا سا لگتا ہے ـــــ شاید یہ جوانی کا احساس تھا۔

ویسے عالم کو محبّت کا تجربہ کبھی نہ ہوا۔

ہاں بستہ پکڑے پل پر سے گذر کر اسکول جاتی لڑکی اُسے اکثر یاد آتی، جو آنکھیں جھکائے اپنی دھن میں چلتی رہتی تھی اور جس کی صورت کچھ کچھ اس کی چھوٹی بہن سے ملتی تھی۔ شاید یہ محبّت تھی ـــــ شاید محبّت لمحے کے اس ادراک کا نام ہے جو دھیرے سے سینے میں آ کر بس جائے اور سورج کی پہلی کرن کی طرح مبہم اور روشنی کا امین ہو ـــــ پر اسے ایسی امانت سنبھال کر رکھنے کی فرصت کہاں تھی۔

وہ اپنا تمام تر وقت مطالعے میں صرف کرتا اور خیالوں خیالوں میں اتنا بڑا ہو جاتا کہ باقی تمام لوگ اسے اپنے سامنے بونے دکھائی دیتے۔

ابّا کی معمولی تنخواہ سفید پوشی کے بھرم میں اُٹھ جاتی۔ اکثر مہینے کی آخری تاریخیں فاقوں میں گزرتیں۔ فاقہ مستی اور وقار کا خیال سب کے حوصلے پست کئے رکھتا۔ وہ ایک دوسرے کیساتھ کم سے کم گفتگو کرتے۔

بہنوں نے جس طرح سینت سینت کر قدم رکھے نوجوانی اور جوانی کی راہوں کو عبور کیا تھا، عالم کو اس کا پورا احساس تھا۔ ان کے کرداروں پر کوئی دھبّہ نہ تھا۔ دلوں پر کیسی کیسی قیامتیں گذار کر ایک نیک نامی حاصل ہوئی تھی۔ عالم کو کیا معلوم۔ وہ تو علم کے سمندر کے کنارے کھڑا لہریں گنتا رہا اور امیدوں کے خوبصورت سنگریزے چن چن کر جیبیں بھرتا رہا اور اب بوجھ اس قدر زیادہ تھا کہ اس سے چلا نہ جاتا تھا۔

تعلیم مکمل نہ ہوئی تھی کہ فسادات شروع ہو گئے۔ ان ہنگاموں میں ابّا اللہ کو پیارے ہوئے۔ افراط و تفریط کا زمانہ تھا۔ عالم نے دل برداشتہ ہو کر کسی قصبہ کے اسکول میں ملازمت اختیار کر لی اور ماں بہنوں کو ساتھ لے گیا وہ اس شہر کو اسطرح خیرباد کہہ گئے گویا مشرقی پنجاب سے

ہجرت کر رہے ہوں اس شہر نے اتنی جدوجہد اور شرافت کے باوجود انھیں کیا دیا تھا۔
کبھی کبھی دل برداشتہ ہو کر عالم سوچتا۔ کاش وہ ہجرت کر کے ہی آئے ہوتے۔ کم از کم لوگوں کے دلوں میں رحم اور ہمدردی کے جذبات تو ہوتے یا پھر سارا خاندان قتل ہو جاتا۔ یا کم از کم اُس کی بہنوں کو کوئی ٹھکانے لگا دیتا۔ وہ تو پتھر کی مورتیاں بنی، اس کا منہ تکتی بوڑھی ہو چکی ہیں۔ وہ اس انتظار میں ہیں کہ گھر اور بَر خود چل کر ان تک آئیں۔ وہ خود ہی بھاگ جائیں۔ چلی جائیں۔ وہ زیادہ تلخی سے سوچتا۔ حد ہے، فرد اپنے ہر عمل کیلئے خود ذمہ دار ہے پر اس کی شادی کوئی کرے — سوسائٹی کرے — واہ — شرافت کیا ہے؟ شرافت کا پرچار فرد کو بزدل اور تابع بنانے کا حربہ ہے۔ اور کمزور لوگ اس خول میں رہ کر بڑے خوش رہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں، ہم سچے ہیں اور اچھے ہیں۔
عالم کا ذہن بعض اوقات باغیانہ تفکر یں بھرنے لگتا تھا۔

اچھی زندگی کا متلاشی عالم بچپن سے کش مکش کا عادی تھا اس نے نوکری کے ساتھ تعلیم جاری رکھی۔ آخری ڈگری حاصل کرنے تک اس کی عمر اٹھائیس تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ سرکاری ملازمت کی امید بالکل ختم تھی۔ پھر سفارشوں اور کمیشن کھانے کا زمانہ۔ البتہ ملک صنعتی ترقی کی طرف گامزن تھا۔ کئی اسکیمیں اور منصوبے بن رہے تھے۔ ملیں اور کارخانے فرمیں اور دفتر، سینکڑوں پرائیوٹ ملازمتیں۔ عالم کو ڈھارس بندھی۔ وہ انگریزی اخبار محض نوکریوں کے اشتہار دیکھنے کے لئے خریدتا۔ درخواستیں اور سارٹیفکٹوں کی نقلیں ہر روز روانہ ہوتیں مگر کہیں ہاتھ نہ پڑتا تھا۔
آج ایک معقول ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو ہونیوالا تھا۔ انھارٹیز نے اُسے کال بھیجی تھی۔ وہ کبھی خوش ہو جاتا اور کبھی خوفزدہ اور افسردہ۔ وہ سوچتا تھا فرم کا مالک کیسا ہوگا؟ فرفر انگریزی بولتا ہوگا۔ اور چھوٹے اسکولوں میں کام کرنے سے سے انگریزی بولنے کا

کامپلکس (COMPLEX) ہو گیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی زبان سے، دیسی زبان کے کئی الفاظ یوں غائب ہو گئے جیسے وہ غلامی کا طوق تھے اور ان کو اتار پھینکنا نہایت ضروری تھا۔ معمولی لوگ انگریزی میں بات چیت کرنے میں فخر محسوس کرتے۔

جو زبان یا رسم و رواج نچلے طبقے میں چلے جائیں ان کی جڑیں زمین میں پیوست ہو جاتی ہیں اور تہذیب کے پودے کو پیوند لگ جاتا ہے۔ پاکستان میں نئی تہذیب جڑیں پکڑ رہی تھی اور عالم جیسے سہج سوچنے والے لوگ جس تس کا منہ تکتے، حیران تھے۔ آبِ حیات کی صراحی سے قطرہ قطرہ دن بہے جاتے تھے۔

"حرامی ہے وہ شخص جس نے وقت کے تخم سے جنم نہیں لیا ——"

وہ سوچتا اور ماں سے بحث کرنے لگتا۔ لیکن ماں ہمیشہ تحمّل سے جواب دیتی۔

"ہم روایت سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ ہم اقتدار کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے منزل تک پہونچتے ہیں۔ نیچے نہیں آ سکتے۔ نیچے موت ہے۔"

اخلاقی معیار کے سنگھاسن پر بیٹھی ماں اسے سمجھاتی رہتی۔

"دو قسم کے لوگوں کے لئے جی جلانا مقدّر ہے بیٹے۔ ایک وہ جو اپنے دور سے پیچھے ہیں، دوسرے وہ جو آگے بڑھ کر سوچتے ہیں۔"

اور جب وہ پوچھتا کہ ماں تمھاری دانست میں ہم کہاں ہیں؟ تو وہ تسلی بخش جواب نہ دے پاتی اور وہ تلملا کر رہ جاتا۔ اپنے بارے میں وہ خود جانتا تھا کہ اس میں باغیوں اور انقلابیوں والی صلاحیتیں قطعی نہیں۔ وہ تو اس شکست کا اعتراف تھا جو ذات اور زمانے کی کشمکش کا نتیجہ ہوتی ہے۔

رات ہولے ہولے بیت رہی تھی۔ کب سویرا ہوگا۔ کب سورج کی حیات بخش روشنی پھیلے گی —— وہ سوچتا رہا، جاگتا رہا۔

بڑی بہن نے ناشتہ تیار کیا لیکن طبیعت بھری ہوئی تھی۔ جیسے آج اُسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

وہ چائے کے دو چار گھونٹ پی کر گاڑی پر سوار ہو گیا۔ دن طلوع ہونے تک وہ اپنے پرانے اور مانوس شہر میں پہونچ گیا۔ شہر کے سکوت نے اسے آغوشِ مادر کی طرح خوش آمدید کہا۔ "ارے کہاں رہے اتنے دنوں؟" جیسے شہر پوچھتا ہو۔ عالم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اب ہم واپس آجائیں گے۔ یہیں رہیں گے۔ نوکری مل جائے گی۔ ایکدم تین سو روپے ___ پیسے اور پیٹ کے لئے لوگ اپنے پیاروں کو بھی چھوڑ جاتے ہیں ___ ہیں نا؟ وہ اپنے ساتھ، شہر کے ساتھ گفتگو کرتا ہوا چل رہا تھا۔

فرم کی بلڈنگ کتنی بڑی تھی۔ عالم نے اسکے سامنے پہونچکر ٹھنڈی سانس بھری۔ "ارے ابھی کل تو یہاں جوہڑ تھا ___ دنیا کتنی جلدی بدل جاتی ہے ___"

دفتر کے اوقات کار ابھی شروع نہ ہوئے تھے۔ وقت گذارنے کے لئے یوں اِدھر اُدھر ٹہلتا، انٹرویو کے لئے جوابات تیار کرتا رہا۔ حتیٰ کہ لوگ آنے لگے۔ وہ برآمدے میں بچھی ہوئی بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ چپراسی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پوچھا۔

"امیدوار ہیں ___"

"جی ___"

"بڑے صاحب تو دیر سے آئیں گے۔ پھر ان تک پہونچنا، اللہ رے توبہ ___"

چپراسی نے خود ہی بتایا اور معنی خیز نظروں سے دیکھا ___" بابو کوئی سفارش ہے؟"

"نہیں۔" عالم نے پھر مختصر جواب دیا۔

"مگر بابو! اتنے علم کے ساتھ ایک ماہ کی محنت کے بعد تین سو روپے کا منہ دیکھو گے ___ کوئی کاروبار کرو۔"

عالم وہاں سے اُٹھ کر برآمدوں میں گھومنے لگا۔ چپراسی کی گفتگو اُسے مایوس

کئے دیتی تھی ـــــ جاہل کہیں کا، اسے کیا معلوم کہ تین سو روپے کیا چیز ہیں ـــــ سالا جلتا ہے ـــــ وہ جو اندر فائلوں میں جھکے کام کر رہے ہیں سب بیوقوف ہیں ـــــ تین سو روپے کا مطلب ہے تیس ہزار پیسے۔ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے تو زندگی کی تین لاکھ سانسیں بڑھ جاتی ہیں۔

اب اس پر مایوسی کا غلبہ کم سے کم تھا اور وہ بڑی پر امید باتیں سوچ رہا تھا ـــــ اگر صاحب نے سلیکٹ نہ کیا تو کیا واپس بھی نہ لوٹنے دے گا۔ لیکن برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑا چھریرے بدن کا نوجوان بار بار رومال سے پیشانی پونچھ لیتا اور اپنے کاغذات کو اُلٹنے پلٹنے لگتا۔ ذرا پرے کھڑکی کے پاس کھڑے دو چھوکرے سگریٹ پر سگریٹ جلائے جاتے تھے اور اعتماد کے ساتھ بلند آواز میں گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بلڈنگ کا پچھلا حصّہ زیرِ تعمیر تھا۔ مشینیں اور انسان کام میں جُتے تھے۔ بھیگے ہوئے سیمنٹ کی سوندھی خوشبو بھلی لگتی تھی۔

مزدوروں کے کسرتی بدن دیکھ کر عالم کو اچھی صحت کی تمنا کچھ اس طرح ہوئی جیسے کوئی بوڑھی کنواری، مرد کی آرزو کرے۔ وہ خود کیسا دُبلا پتلا اور کمزور تھا۔ بہتر زندگی کے حصول کی جدوجہد اُس کے جسم کے ساتھ امربیل کی طرح چمٹی خون کو چاٹ گئی تھی۔

دنیا کتنی مصروف جگہ ہے اور انسانوں کا کام مشینیں کرنے لگی ہیں۔ لوگ کیا کریں گے ـــــ ضروریات اور خواہشات کا کیا ہو گا؟ لوگ اپنی بھی خواہشات کو مار کر ہائیڈروجن بم کی خواہشات کرنے لگیں گے ـــــ خواہش ـــــ خواہش ـــــ تمنا ـــــ پھر حسرت ـــــ پھر موت۔

عالم بے کار سوچے جاتا تھا اور طبیعت اُداسی اور ملال کی طرف مائل تھی۔

دن کے دس بج چکے تھے۔ ابھی انٹرویو بورڈ نے کارروائی شروع نہ کی تھی۔

دفتر کے ملازمین امیدواروں کو رحم بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ نظریں ہٹا کر بلڈنگ کی چھتوں اور دروازوں کو دیکھنے لگا۔

کوئی اس کے عقب سے پکارا۔

"انٹرویو دینے والے حضرات آجائیں ——" آن کی آن میں کئی لوگ جمع ہو گئے پھر وہ منتبہ لوگوں کی طرح اپنا اپنا نام ٹِک مارک کرواتے ہوئے گزرنے لگے۔ اتفاق سے عالم پہلے نمبر پر تھا —— انتظار گاہ میں بیسیوں امیدوار چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

انٹرویو بورڈ کے سامنے جاتے ہوئے وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے وہ نہیں اس کا ہمزاد سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ تو بس چپ ہے اور دیکھتا ہے۔ اسے ڈھب سے نہ تو سنائی دیتا ہے اور نہ ہی سجھائی دیتا ہے۔

"تشریف رکھئے ——"

کسی نے کہا —— عالم نے دیکھا سامنے چھ سات مرد بیٹھے ہیں۔ اور ان میں ایک جانی پہچانی صورت ہے —— وہ کون ہے؟

"یاری —— اویار ——"

عالم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"پوچھو جی —— پوچھو ——"

"یس سر ——" پہلا شخص بولا۔

جانے ادھر سے کیا سوال ہوا —— عالم بولنے لگا۔

"اوئے یاری تیری بھینسیں کہاں گئیں؟ اور تیرے باپ کا کیا حال ہے؟ پرچون کی دوکان پر کھٹی میٹھی گولیاں بیچتا ہے اور تیری بہنیں گوبر تھاپتی ہیں کہ نہیں؟ —— یاری —— اوئے یاری ——"

کسی نے اسے عقبی دروازے سے باہر دھکیل دیا۔

"پاگل —— حرامی ——" کوئی غصّے سے دروازے کے پٹ بند کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔

عالم سڑک پر بلا مقصد بھاگ کھڑا ہوا۔

"ماں —— ماں —— پاگل —— ہاہا —— تو نے مجھے وقت کی بوند سے نہیں جنا، نہ اس بہتے ہوئے پانی سے میری آبیاری کی۔ میں حرامی ہوں —— اور تو فریب خوردہ عورت —— ہاہا"—— وہ ڈاکیومنٹس اور سرٹیفکٹوں کے پلندے کو سینے سے لگائے بکے جا رہا تھا۔

انور عنایت اللہ

یادوں کے چراغ

وہ ہوائی جہاز میں داخل ہونے سے پیشتر حسب معمول رُک کر مڑتی ہے اور میری طرف دیکھتی ہے۔ پھر ہاتھ اُٹھا کر ہلاتی ہے اور اندر چلی جاتی ہے۔ آج بھی یوں لگتا ہے جیسے کہنا چاہتی ہو تم مجھے یہیں روک کیوں نہیں لیتے؟ اتنی مختصر سی ملاقاتیں کیا ایسے جذبات پیدا کر سکتی ہیں؟ اپنائیت کا اظہار کیا صرف زبان ہی سے ہو سکتا ہے؟ ان سوالوں کا مجھے کبھی جواب نہیں ملا۔

میرے سامنے جہاز کھڑا ہے۔ اب اس کی سیڑھیاں ہٹالی جاتی ہیں۔ دروازہ اندر سے بند ہو جاتا ہے اور جہاز تاریک رَن وے پر آہستہ آہستہ رینگنے لگتا ہے۔ میں چھڑی کے سہارے کھڑا، چندھیائی آنکھوں سے ان ٹمٹماتے روشن قمقموں کو دیکھنے لگتا ہوں جو رن وے کے دونوں طرف لگے ہوئے ہیں اور دور اُفق میں کہیں کھو جاتے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد جہاز کی آواز تیز ہو جاتی ہے اور وہ رَن وے پر دوڑنے لگتا ہے، اور پھر یکایک فضا میں بلند ہوتا ہے اور فاصلے ایک بار پھر تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں۔ یہ کمبخت جیٹ ہوائی جہاز پلک جھپکتے ہی زمین سے اوپر اٹھتا ہے اور پھر سیکڑوں گز کی بلندی پر آسمانوں پر جا پہنچتا ہے۔ آج تو مطلع ابر آلود ہے اس لئے ہوائی جہاز فوراً نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ صرف آواز سنائی دیتی ہے۔ چند لمحوں کے بعد یہ آواز فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے اور ان لمحوں کی

یاد باقی رہ جاتی ہے جو میں نے لاؤنج میں اس کے ساتھ گزارے تھے۔

جمعہ کی رات کراچی کے ہوائی اڈے کی مصروف ترین رات ہوتی ہے۔ رات بھر مشرق اور مغرب سے ہوائی جہاز یہاں اُترتے ہیں اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ یہاں سُستا کر اپنی منزلوں کی طرف اُڑ جاتے ہیں۔ اس کا جہاز بھی عموماً جمعہ ہی کی رات کو کراچی سے گزرتا ہے۔ جب میرے آس پاس کے لوگ واپس لوٹ جاتے ہیں تو میں بھی ٹھنڈی سانس لے کر مڑتا ہوں اور نیچے کار تک جاتا ہوں۔ میرے انتظار میں شوفر اپنے چہرہ پر ٹوپی رکھے سو رہا ہوتا ہے، میں اسے جگاتا ہوں تو وہ مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے میرا یہاں آنا اس کے لئے بھی ایک معمّہ ہے۔

میں گھر پہنچتا ہوں تو ایک عجیب خاموشی میرا استقبال کرتی ہے۔ دونوں بچّے غالباً سو چکے ہیں۔ عادل شاید جمخانے سے ابھی واپس نہیں آیا۔ صرف شاہدہ جاگ رہی ہے۔ میں گھر میں داخل ہوتا ہوں تو وہ میرے ہاتھ سے چھڑی لے لیتی ہے۔ میں صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں تو وہ پوچھتی ہے "اوولٹین۔"

"نہیں۔" میں جواب دیتا ہوں۔

"پی لیجئے۔ آپ نے تو آج کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"مجھے بھوک نہیں۔" میں جواب دیتا ہوں۔

"آپ شاید مجھ سے بھی خفا ہیں۔" وہ نظریں جھکا کر آہستہ سے کہتی ہے

"نہیں بیٹی ـــ میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔ آج عادل نے میرے ساتھ زیادتی کی. میں اس سے بھی خفا نہیں ہوں۔" میں جواب دیتا ہوں۔

"انھیں معاف کر دیجئے ابّا ـــ پچھلی جنگ میں انھیں اتنے دھچکے لگے کہ وہ آپ کی باتیں سمجھ ہی نہیں سکتے۔"

"اور تم بھی؟" میں آہستہ سے پوچھتا ہوں۔

"کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر آپ اس لڑکی سے ملنے ایرپورٹ

جاتے ہیں تو میں سمجھتی ہوں اس میں بھی ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ میری شادی کو آٹھ سال ہو گئے۔ میں نے کبھی آپ کو کوئی غلط بات کرتے یا غلط قدم اُٹھاتے نہیں دیکھا۔ پھر یہ میں کیسے مان لوں کہ آپ اس سے مل کر غلطی کر رہے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے وہ چلی جاتی ہے اور چند لمحوں کے بعد میرے چپل، میرا ڈریسنگ گاؤن اور سلیپنگ سوٹ لے آتی ہے اور کہتی ہے۔" ابّو ــــ میری ایک بات مانئے گا؟ مُنہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیجئے۔ میں اوولٹین لے آتی ہوں۔"

میں انکار کرنے ہی والا ہوتا ہوں کہ وہ مجھے روکتی ہے۔ اور کہتی ہے۔"ابّو ــــ اگر آپ نے انکار کیا تو میں یہی سمجھوں گی کہ میں آپ کی بیٹی نہیں، بہو ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ مجھے اتنی محبّت سے دیکھتی ہے کہ میری عینک کے شیشوں پر دُھندسی چھا جاتی ہے اور اس کا چہرہ مجھے صاف دکھائی نہیں دیتا۔ آج کنول ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لئے مجھ سے جُدا ہوئی تو اس وقت بھی میری یہی کیفیت ہوئی تھی۔ کیا عمر کا تقاضا یہ بھی ہے کہ بڑھاپے میں دل اس قدر کمزور ہو جاتا ہے؟ شاید کنول کو میری آنکھوں کے آنسو نظر آ گئے تھے۔ اسی لئے اس نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا اور کہا تھا ــــ

"ارے آپ اتنے گرانڈیل پاکستانی اور اس طرح آنسو بہا رہے ہیں؟ آنسو مجھے بہانا چاہئے کیونکہ جب بھی میں آپ سے مل کر جاتی ہوں مجھے اپنی ماں یاد آ جاتی ہے جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اپنے تمام رشتے دار یاد آ جاتے ہیں جن سے نہ میں کبھی ملی اور نہ ملوں گی۔ اور ہر بار مجھے یہی لگتا ہے جیسے ہماری یہ آخری ملاقات ہے۔ اس لئے نہیں کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ بھگوان آپ کا سایہ مجھ پر ہمیشہ قائم رکھے ــــ نہیں نہیں، اس لئے نہیں بلکہ یوں لگتا ہے کہ جیسے میں کراچی سے نہ گذر سکوں ــــ اچھا ــــ اب آنسو پونچھ لیجئے اور مجھے پیار سے آشیرواد دیجئے!"

شاھدہ بھی مجھے اتنی ہی محبت سے دیکھ رہی ہے، شاید اسی لئے آنسو دوبارہ بہہ نکلے ہیں۔ پھر میں اسے اپنے پاس بٹھا لیتا ہوں اور کہتا ہوں۔"بیٹی دوستی کے بندھن بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ ان کا ذات پات، رنگ و نسل، قومیت یا جنس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

انھیں زمانے بھر کی آندھیاں اور طوفان بھی کبھی نہیں توڑ سکتے ـــــــ میں اُس وقت کی باتیں سُنانے لگا ہوں جب عادل، تمہارا شوہر تین سال کا تھا۔ میرے بچپن کے کئی دوست تھے جن کے ساتھ میں پلا، بڑھا۔ ان میں جوالا پرشاد بھی تھا جن کا خاندان ہمارے پڑوس میں آباد تھا۔ وہ، میں اور اس کی بہن شیاما ـــــ ہم سب ساتھ ہی کھیلے کودے اور پلے بڑھے تھے۔ جس دن شہر میں فسادات کی آگ بھڑکی، عادل اپنی امّی کے ساتھ صبح ہی سے اپنے نانا کے یہاں سول لائنز چلا گیا تھا جو انگریزوں کا محلّہ تھا۔ میں گھر میں تنہا تھا اور جوالا پرشاد کا پڑوسی ہونے کی وجہ سے بڑے اطمینان سے بیڈ روم میں روشنی کئے کوئی تازہ رسالہ پڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف شہر میں آگ لگی ہوئی تھی لیکن میرے یہاں امن تھا۔ احتیاطاً میں نے تمام دروازے پھاٹک اور کھڑکیاں بند کر لی تھیں۔ تقریباً نو بجے کسی نے آہستہ سے میرے بیڈ روم کی کھڑکی کھٹکھٹائی۔ میں چونک کر اُٹھا۔ جب چند لمحوں کے بعد دوبارہ کسی نے کھٹکٹائی تو میں اُٹھا اور میں نے آہستہ سے پوچھا "کون ہے ؟"

اس پر مجھے دھیمی سی شیاما کی آواز سُنائی دی۔ "بھیّا۔ کمرہ کی روشنی گل کر دیجئے اور کھڑکی کھولئے۔ میں اندر آنا چاہتی ہوں۔"

میں نے فوراً یہی کیا اور جوں ہی کھڑکی کھولی وہ جلدی سے اندر آگئی۔ ہم نے کھڑکی بند کر دی اور پھر میں نے روشنی کر دی۔ وہ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی تھیلی تھی۔

"بات کیا ہے شیاما ؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔ یہ سُننا تھا کہ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"عادل کہاں ہے ؟" اس نے روتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے نانا کے یہاں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بھگوان تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے ــــ جلدی کیجئے بھیا۔ یہ کپڑے بدل لیجئے"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے تھیلی میں سے ایک دھوتی، کرتا اور گاندھی ٹوپی نکالی اور میرے حوالے کر دی۔ "زیادہ وقت نہیں ہے بھیا۔ آج رات آپ کے گھر پر حملہ ہونے والا ہے!"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں بھیا ــــ بڑے بھیا اپنے غنڈے دوستوں کے ساتھ بڑا مندر کے علاقے میں لوٹ مار مچا رہے ہیں۔ وہاں سے وہ کسی بھی وقت واپس آسکتے ہیں۔ آج محلے میں بہت کم لوگ ہیں۔ واپس آکر آپ کے گھر کا صفایا کریں گے!"

آنسو تھے کہ اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ دور سے چیخ و پکار کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ مشرقی اُفق سے قریب آسمان کی سُرخی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید کہیں آگ لگی تھی۔ میں نے جلدی سے کپڑے بدلے اور پھر ہم کھڑکی ہی کے ذریعے باہر نکل آئے۔ اس کے کہنے پر میں نے گھر کی تمام روشنیاں جلا دیں۔ جب ہم پھاٹک پر پہنچے تو اس نے آہستہ سے کہا۔

"بھیا ــــ آپ رام کشن ہیں اور میں آپ کی بیوی شیاما"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "گھبراؤ نہیں بھیا۔ میں آپ کو سول لائنز پہنچا دوں گی۔ اوّل تو ہمیں کوئی نہیں پہچانے گا۔ یہاں کسی کو ہوش نہیں ہے۔ اگر کسی نے پہچان بھی لیا تو میرے ہوتے وہ آپ پر حملہ نہیں کرے گا۔"

جانے وہ کیا کچھ کہہ گئی۔ مجھ پر تو گویا سکتہ طاری تھا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے یوں چل رہی تھی اور یوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی جیسے ہم واقعی میاں بیوی ہوں۔ ہم تاریک اور نیم تاریک گلیوں میں سے ہوتے ہوئے خیریت سے سول لائنز پہنچ گئے اور پھر وہ مجھ سے جدا ہو گئی ــــ آخری بار جدا ہو گئی ــــ!"

میں رُک کر اپنی عینک کے شیشے صاف کرتا ہوں۔ شاہدہ بڑے انہماک سے میری

کہانی سُن رہی ہے۔

"جانتی ہو بیٹی اُس رات میں جان بچانے کی اُسے کتنی کڑی سزا ملی؟ —— جب آدھی رات کو غنڈوں نے میرے گھر پر حملہ کیا اور انھیں میں گھر پر نہیں مِلا تو میرے عزیز دوست جوالا پرشاد کا ماتھا ٹھنکا۔ اسے وہاں کپڑے کا وہ تھیلا مِل گیا جس پر ان کے دوکان کی مہر لگی ہوئی تھی۔ وہ غصّہ میں اپنی بہن کے پاس گیا تو شیاما نے مان لیا کہ اس نے مجھے حفاظت سے سول لائنز پہنچا دیا تھا۔ یہ سُننا تھا کہ وہ آگ بگولا ہو گیا اور اس نے اس کی پروا کئے بغیر کہ اس کی بہن ایک بچّے کی ماں بننے والی تھی اسے خوب مارا پیٹا۔ صبح تک رام کشن کو بھی تمام واقعات کی اطلاع مِل گئی۔ دن کی روشنی میں محلّے کی کئی عورتوں اور بچّوں نے گواہی دی کہ وہ کل رات ایک غیر کا ہاتھ تھامے بڑی سڑک پر نظر آئی تھی۔ اس دن پنچایت بیٹھی۔ خود جوالا پرشاد نے فیصلہ صادر کیا کہ ایسی ذلیل بہن کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ رام کشن نے فیصلہ سُنایا کہ نہ وہ اس کی بیوی ہے اور نہ اس کے بچّے کی ماں۔ بچہ نہ جانے کس کا ہے۔ شیاما کو گھر سے نکال دیا گیا۔ محلّہ بدر کر دیا گیا۔ اسے ایک آشرم میں پناہ مِلی جہاں اس جیسی بہت سی بدنصیب عورتیں رہتی تھیں۔ وہیں کنول پیدا ہوئی۔ بچّی کی پیدائش کے فوراً بعد اس نے دم توڑ دیا۔ بچّی کو آشرم والوں نے پالا۔ جب وہ بڑی ہوئی تو اُسے اس کی ماں کا ایک خط دیا گیا جس میں شیاما نے اپنی داستانِ غم سُنائی تھی اور میرے بارے میں سب کچھ بتایا تھا۔ اس کے بعد کنول نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور اب جب بھی وہ ہوائی جہاز میں کراچی سے گزرتی ہے، میں اس سے ملنے ایئر پورٹ ضرور جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے ایک غیر مسلم خوبصورت نوجوان ایئر ہوسٹس سے بلا ناغہ ملنا یہاں والوں کو بالکل نہیں بھاتا، خود میرا بیٹا نہ جانے کیا سوچتا ہے —— لیکن بیٹی —— تم ہی بتاؤ —— کیا میں بھی اس بدقسمت لڑکی کا ساتھ اسی طرح چھوڑ دوں جس طرح اس باپ، ماموں اور دوسرے رشتہ داروں نے چھوڑا تھا؟ —— کیا واقعی بعض بندھن اتنے مضبوط نہیں ہوتے جنھیں زمانے بھر کی آندھیاں اور طوفان بھی کبھی نہیں توڑ سکتے؟ ——

سید رفیق حسین

گوری ہو گوری

چوماسہ کی اندھیاری رات تھی۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جھینگروں نے جھنکار مچا رکھی تھی۔ مینڈک بول رہے تھے۔ ٹر، ٹر، ٹر پیپل کے سوکھے ڈگالے پر الو کہتا تھا ہک ہو۔ ہک ہو۔

بسنتی نے کروٹ لی۔ پھر منہ پر تھپڑ مارا بولی "ہائے رے۔ ارے رام کیسے ڈانس لاگیں۔"

پیپل پر اُلو بولا۔ ہک ہو، ہک ہو۔

چھ مہینے کا بچہ پاس لیٹا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ لیا اور بسنتی بولی "مری جائے۔ پھر آئے بیٹھا۔ بولت کیسے ناس پیٹا۔"

ہک ہو، ہک ہو۔

"اجی او جی ——— اٹھو نا۔ گھگو بولے۔ موہے ڈر لاگے۔"

مادھو نے اس کا ہاتھ جھٹکا، بولا "سوون دے ری۔ اری نا کھائے لے تو ہے۔"

"اٹھو جی اٹھو۔ موہے ڈر لاگے۔ تنی اڑائے دے۔ او کھو۔"

"مادھو" ادھر سے تو را ڈر" کہتا ہوا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا یا مے نیچے پیر لٹکا لیے جلدی سے پھر اوپر کھینچ لیا۔ گھبرا کر پھر نیچے دیکھا۔ پھر ادھر دیکھا۔ چھوٹا سا کچا

گھر تھا۔ چھوٹی چمنی کی دھوئیں سے کالی لالٹین تھی۔ دھیمی روشنی میں آنگن بھر جھلملا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔

مادھو بولا" جو کا ہوا رے!"

بسنتی گھبرا کر اٹھی۔ بولی" اجی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام۔ بھیکا کو جگا لو۔ ارے رمکلیا کو جگا لو۔ ارے ان ہن کی بیڑھی لو۔ پانی آئے گیا رے۔ ارے او بھیکا۔ رمکلیا ہو اری او رمکلیا۔ سوئے جات رے۔ ارے اُٹھ اُٹھ او بھیکا"

آٹھ برس کی دُبلی پتلی رمکلیا جاگی۔ چھ برس کا بھیکا جاگا۔ دودھ پیتا پاس لیٹا بچہ جاگا۔ یہ رویا، وہ چلائے" اری میاری۔ مو ہے لئے لے بالپو رے۔ اری میاری"

"چپ کرو چپ" مادھو نے ڈانٹا۔ خاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ بسنتی نے دھیان دیا۔ دور کہیں سے آواز آ رہی تھی۔ گڑپ۔ شل شل شل۔ گڑپ شل شل شل۔

گھگو بولا۔ ہک ہو۔

بسنتی روتی ہوئی چلائی" ارے پریتم بھیا آئی گئی۔ ارے مورے بچے کی جو رے"

کھٹولے سے کود۔ پانی میں چھپاتے بچے ماں سے چمٹے۔ مادھو اٹھا، دیکھنے کو دروازے کی طرف چلا۔ بسنتی روئی" اجی جاوت کہاں ہو جی"

باہر سے آواز آئی" مادھو بھئیا ہو۔ او مادھو۔ ارے باڑھ آئی۔ اُٹھ رے اُٹھ"

شڑپ، گڑپ، شل شل شل۔ پانی کے بہنے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

مم مم۔ مَیں۔ بکری بولی۔ ماں۔ ہاں آں۔ ماں ہاں آں۔ کہیں گئیاں چلا رہی تھیں۔ بارہ گھر کے گوجر پُروے میں ہلچل مچ گئی۔ سب جاگ اٹھے۔ سب بھاگنے لگے۔ کوئی پکارتا تھا۔ کوئی چلاتا تھا۔ کوئی روتا تھا۔

مادھو نے رمکلیا کو کوٹھے کی سیڑھیوں پر کھڑا کر دیا۔ بھیکا کو گود میں لیا اور سامان رکھنے اور اٹھانے میں لگ گیا۔ بسنتی نے گود والی لڑکی کو دبائے دبائے

چون کی لکی اٹھائی۔ تیرتی ہنڈیا پکڑی۔ مٹکا کترایا ہوا پرے سے نکلا جاتا تھا اُسے پیر سے روکا۔ کھٹیا نے سر ہلایا۔ پھر وہ بھی گھومی۔ دری۔ بچھونا۔ کھتری سب کچھ اس پہ تھا۔ لو وہ بھی چلی۔

گھر کے باہر آدمی اور جانور چلا رہے تھے۔ گھر کے اندر رمکلیا اور بھیکار دے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ بسنتی اور مادھو گھر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا" بھاگو بھاگو۔ او بسنتی نکل، ارے مادھو بھاگ۔"

پانی نے ہچکولا لیا۔ پنڈلی سے اُچکا۔ رانوں تک آیا۔

بھاگو بھاگو۔ مادھو بھیا بھاگو رے۔ ارے کا ہوئے گیا۔ نکلت کاہے ناہیں"۔ باہر سے آوازیں آئیں۔ پانی نے پھر ہچکولا لیا۔ آگے بڑھا۔ پیچھے ہٹا اور ران سے کمر تک آیا۔ بسنتی روئی" ارے مورے کرم۔ ارے موری ہنسلی تو نکال لے رے۔"

"چل چل تو چل نکل۔ میں لایا۔ ارے لون چون تو لئے لوں۔ اُڑھنا بچھونا تو دبائے لوں ـــ"

پانی کا شور تھا۔ چار آدمیوں کا چلانا تھا۔ دروازہ پر دھکے تھے۔ وہ کھل گیا۔ آدمی گھر میں آگئے۔ مادھو اور بسنتی کو پکڑ کر گھسیٹا" چالو۔ چالو۔ سب چھوڑو۔ جان ہی بچائے لو۔ چالو۔ چالو"۔

اس گڑ بڑ میں۔ جلدی میں گھبراہٹ میں، اندھیرے میں دری، بچھونے کپڑوں کے لئے پکارتی۔ ناج اور ناج کی گٹھیوں کے لئے پکارتی۔ برتنوں اور زیوروں کے لئے پھڑکتی بسنتی نے یہ بھی کہا" بھیا رے رمکلیا کو لے لے رے"۔ لالٹین ڈوب چکی تھی۔ اندھیرے میں کسی نے جواب دیا" موں اٹھائے لوں۔ تو تو چل۔ اری نکس باہر رے"۔

پانی کی شل شل۔ رات اندھیری۔ بادل کی گرج، بجلی کی چمک۔ کمر کمر سینے سینے پانی میں بیس تیس آدمی پچاس ساٹھ مویشی چلے۔ ہر آدمی بول رہا تھا۔ ہر جانور چلا رہا تھا۔

کوئی گرتا تھا دوسرا سنبھالتا تھا۔ کوئی ڈوبتا تھا۔ دوسرا ابھارتا تھا۔ شروع میں تو سب جتھا بنائے ایک دوسرے کو سنبھالتے ٹپروں سے باہر چلے۔ آموں کے باغ کے اندر سے ہو کر پون میل کے فاصلے پر دور ریل کی اونچی پٹری کا رُخ کیا تھا لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اندھیرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

مادھو اور بسنتی ایک دوسرے کو پکڑے ہوئے تھے۔ دودھ پیتی لڑکی اور بھیکا ان کے ساتھ تھے۔ رمکلیا کو بھی کسی نے کوٹھے کے زینے پر سے اٹھا لیا تھا۔ ان کو اس کا اطمینان تھا مگر مادھو کو اپنی گائے اور چار بیلوں کی فکر تھی جو گاؤں سے باہر کنوئیں کے پاس بنگلیہ پہ اس کے سالے کے ساتھ رہتے تھے۔ بسنتی کو ڈھوروں کی اتنی فکر نہ تھی اب وہ اپنے بھائی کے لئے بیتاب تھی۔" ادھر تو وہ اکلاّ ہی رہتا ہے۔ نہ جانے جاگا کہ نہیں۔ کا جانے آیا کہ نہیں"۔ مادھو نے گرتی ہوئی جورو کو سنبھالتے ہوئے دُہرایا۔" کوؤ جانے جاگا کہ ناہیں۔ کا جانے بردے کھولے کہ ناہیں"۔

اندھیری رات تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پانی کمر اور کمر سے اونچا تھا۔ ساتھی سب بچھڑ بچھڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ ادھر ادھر دور اور نزدیک آوازیں ان کی آرہی تھیں۔

" جانکی ہو جانکی "۔

" آئے رہوں دادا "۔

" مرلی رے مرلی "۔

" بھلا رے بھلا۔ چاہے چلو "۔

مادھو بھی بار بار سالے کو پکارتا تھا" ناگا او ناگا" اور جواب نہ آتا تھا۔ اب پانی میں شور کے ساتھ زور بھی بڑھا۔ کسی نے اندھیرے میں پکار کر کہا۔" لین کے لگے نہریا ہے نہریا"۔ کوئی بولا۔" سنبھلے سنبھلے نکلے چالو"۔ کسی نے کہا۔" ڈٹے رہو بھیا۔ ڈٹے

رہنا بھیّا۔ آگئی لین۔"

ایک دفعہ اندھیرے میں ناگا کی آواز آئی۔"مادھو بھیّا ہو۔ کوئی مادھو بھیّا دیکھو؟"

کسی نے جواب دیا۔"بڑا دکھوئی یا۔ ہاتھ لو تو لوکت ناہیں۔"

مادھو نے جلدی سے پکار کر جواب دیا۔"بھلی ہے بھلی۔ آت ہوں۔ بدوے لے آیا رے؟"

ناگا چلّایا۔"بسنتی کِتے بولت ناہیں!"

"ارے ہے رے مورے ساتھ۔ بدوے کِتّے چھوڑے ہو لے آیا رے؟"

"آئے جاؤ۔ آئے جاؤ۔" آر، کے، آر کی لائن پاس آگئی تھی۔ ناگا دو گز پانی کے باہر کھڑا تھا۔

ڈکراتی بھینسیں، چلّاتی گائیں، ممیاتی بکریاں، روتے بچے، سہمی عورتیں، پکارتے مرد، سب بھیگے، سب پانی ٹپ ٹپاتے ریل کی پٹری پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سونی پٹری آباد ہو گئی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ کون کون آگیا ہے اور کون کون رہ گیا۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پُروے کی پوری آبادی کی مردم شماری کی گئی۔ آدمیوں اور جانوروں دونوں کی گنتی ہوئی۔ جانور سب موجود تھے۔ آدمیوں میں ایک چمار کا لڑکا اور دو سگے بھائی کُرمی کم تھے۔ بچوں میں رمکلیا کم تھی۔ بسنتی نے رمکلیا کے واسطے اور چمار چمارن نے لڑکے کے واسطے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ دونوں کرمی بھائیوں کے رشتہ داروں کو اطمینان تھا کیونکہ ایک تو دونوں تیراک تھے دوسرے کافی اونچے مکا کے کھیت میں مضبوط اور اونچے مچان پر وہ سوئے ہوئے تھے۔

رمکلیا کی ماں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ سب دلاسہ دیتے تھے۔ ہر کوئی

سمجھاتا تھا۔ رو دھونا صبر کر۔ شاید دلوں کرمیوں میں سے ہی کوئی آگیا ہو گا۔ کسی درخت پر ہی لے کر بیٹھ گیا ہو۔ چمار کا لڑکا بھی تو وہیں تھا۔ اس نے ہی تو کہا تھا گودی لے لے گا۔ وہی اس کو لے کر کسی درخت پر چڑھ گیا ہو گا۔ پر ماتا کی ماری دُکھیاری چپ کیسے ہوتی۔ اس کا تو دل ہی ٹوٹا جاتا تھا۔ مادھو بھی چپکا کھڑا روتا تھا۔ ناگا ہچکیاں لیتا تھا۔ اور وہیں پر ان کی گوری گائے کھڑی اڑاتی تھی۔ تو کاں آں ھ، تو کاں آں ھ۔ یہ بھی دکھ سپٹی ماں ہے۔ اسے کوئی جانے نا جانے۔ بچھڑا اس کا بھی نہیں ملتا ہے۔ دُکھیا روتی ہے۔ تو کاں آں ھ۔

روتی ہچکیاں لیتی ہوئی بسنتی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ بسنتی نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں اور رو دی۔

"گوری رے۔ موری رمکلیا۔۔۔۔ اِکھ اِکھ اِکھ اِکھ۔
گوری رے اب تو ہے کون چرائے۔۔۔۔ اِکھ اِکھ اِکھ اِکھ
گوری رے اب تو ہے کون کھلائے۔۔۔۔ اوھ اوھ اوھ اوھ
گوری رمکلیا تو گئی رے۔۔۔۔ اوھ اوھ اوھ اوھ
گوری توری رمکلیا۔۔۔۔ اِکھ اِکھ اِکھ اِکھ
گائے نے وہی لمبی آواز نکالی "تو کاں آں ھ"

کوئی جانے نہ جانے دل کی لگی رام جانے۔ گائے نے چلا چلا کر اور بسنتی نے سسکیاں لے لے کر آخر صبح ہی کر دی۔ نکلتے دن کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پُروے کی طرف اُٹھ گئیں۔ سامنے چھوٹا سا آموں کا باغ تھا۔ اس ہی کے برابر اور کچھ اس کی آڑ میں گوجر پُروا آباد تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ آموں کے درخت تو تھے مکان بہہ چکے تھے۔ اور اگر کوئی بچا کھچا مکان ہو گا بھی تو درختوں کی آڑ میں ہو گا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا جس کے درخت اپنے ہرے ہرے ہاتھ پانی پر پھیلائے مل رہے تھے۔ اور پھر ان کے پار میلوں میلوں جہاں جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا۔ ریل کی لائن کے قریب ہی

جہاں چھوٹا سا نالہ تھا پانی کا دھارا تیزی سے چل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی چار نوجوانوں نے ہمت کی لنگوٹی کس پانی میں کود پڑے۔ تیرتے ہوئے آموں کے باغ تک گئے۔ وہاں چمار اور دونوں کرمی بھائی تو موجود تھے رمکلیا نہ تھی۔ چمار کو تیرنا نہ آتا تھا۔ اور پھر ڈرتا بہت تھا۔ ان لوگوں نے ایک پٹیلا ڈھونڈ لیا تھا جو کہ درختوں میں اُلجھ کر تیرتا ہوا رہ گیا تھا سب نے چمار سے بہت کہا کہ اس پٹیلے پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے اور یہ لوگ کھینچتے ہوئے اُسے لے جائیں گے مگر اس کی عقل میں ہی نہ آئے۔ ڈر کے مارے مرا جائے پانی میں اترے ہی نہیں۔ بہت سمجھایا، خوشامد کی، لیکن راضی ہی نہ ہوا۔ اور جب یہ لوگ اسے درخت پر چھوڑ کر چلنے کو تیار ہوں تو پھر بری طرح سے دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک کی سمجھ میں آگیا۔ چمار کے درخت پر چڑھ کر اور اس کی گردن پکڑ، مارے کس کس کے جو ہاتھ تو راضی ہوگیا۔ پٹیلے کے تختے پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیرتا ہوا سب کے بیچوں بیچ ساتھ ہولیا اور سب باری باری پٹیلے کو دھکیلتے ہوئے لے چلے۔ راستہ میں کسی نے کہا "لے اب بہائے رہے سانچی سانچی ناہیں ڈبوئیں دیں تو ہے اتے ہی۔" بچارے نے سب اُگل دیا کہ ہاں وہ ڈر کے مارے ان چار آدمیوں کے ساتھ ساتھ تھا جو کہ مادھو اور اس کی بیوی بچوں کو نکالنے گئے تھے اور بستی کے چلانے پر اسی نے کہا تھا کہ وہ رمکلیا کو گودی لے لے گا۔ لیکن سب کے سب تو جلدی سے گھر میں سے نکل گئے اور وہ اکیلا جو رہ گیا تو ڈر کے مارے سیڑھیوں کے پاس سے ہی لوٹ آیا۔ باہر آیا تو وہ لوگ نہ ملے۔ پانی اور بڑھ گیا تھا۔ آخر جب باغ میں پہنچا تو اکیلے چلنے کی ہمت نہ پڑی۔ درخت پہ چڑھ گیا۔ یہ سُن کر سب نے کہا "ڈبوئے دو ایسے پاپی کو۔ کیا کرنا ہے جا کر ایسے دُشٹ کو۔"

لیکن ڈبویا نہیں بلکہ ریل کی پٹری پہ اُتار ہی دیا۔

وہاں سیوا سمتی کے سچے خدمت گار کانگرس کے ذرا بڑے اور ذرا مغرور، تھوڑا کام اور بہت باتیں کرنے والے لیڈر، لال صافے والے پولس کے اینٹھتے، اکڑتے سپاہی

موجود تھے۔ مدد ان کی سب ہی اپنی اپنی طرح کر رہے تھے۔ تیل، گھی، آٹا، لکڑی، دال سیوا سمتی والے لائے تھے۔ امن انتظامات پولیس والوں کی طرف سے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چھولداریاں اور مرہم پٹی کا سامان کانگریس والوں کی طرف سے تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہنسی خوشی کھانے پکنے لگے۔ کڑھائیاں چڑھ گئیں، پوریاں تلی جانے لگیں۔ دو چار جن کے اندھیرے میں پانی میں گرتے پڑتے چلنے سے چوٹیں آئی تھیں ان کی مرہم پٹی ہوئی۔ لیکن سبتی نے زخمی دل کی مرہم پٹی کون کرتا۔ مادھو اور ناگا خود ہی پریشان تھے۔ ایک ہمدرد گوری تھی جو رات بھر اس کے ساتھ روئی تھی۔ اب وہ بھی نہ تھی۔ کا جانے بھور بھئے کتے چال گئی۔

جب تک اندھیرا رہا۔ ہڑپ، گڑپ، گڑاپ کرتے پانی نے رمکلیا کو خوب ہی ڈرایا۔ اور روتے روتے بے دم کر کے پھر کی لڑکی کا آنے والے دن نے اپنی بھینی بھینی روشنی پھیلا کر دل ہی دہلا دیا۔ ایک دفعہ ہی چونک کر دیکھتی ہے تو نہ مکان ہیں، نہ گاؤں ہے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھا بہہ چکا ہے۔ ایک کونے پر خود بیٹھی ہے دوسرے کونے پر ایک کالا سانپ کنڈلی مارے بل کھایا بیٹھا دوہری زبان نکال رہا ہے۔ سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے جس میں سے اِکّا دُکا پیڑ کہیں کہیں جھانک رہے ہیں۔ پیچھے آم کا باغ آدھا ڈوبا آدھا نکلا طرح طرح کی لہریں اپنے درختوں میں سے نکال رہا ہے۔

ہراس اور خوف سے رمکلیا چلائی، اور پھر چلائی۔ ڈری، سہمی اور چاروں طرف اس نے گھبرا کر دیکھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایک وہ تھی اور دوسرا کالا ناگ تھا اور پانی ہی پانی تھا جس میں بھنور کی ایسے گھومتے کٹورے بنتے تھے اور ہڑپ ہڑپ کر کے غائب ہو جاتے تھے۔

رمکلیا نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں موندھ لیں تھیں اور "اری میّا ری،

او میری مئیا۔" کہہ کہہ بلک رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی "تو کاں آن ھ۔"
رمکلیا چونکی۔ ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹے۔ آنسو بہتے مردہ چہرے پہ ہلکی مسکراہٹ آئی۔
"تو کاں آن ھ"، آواز پھر آئی۔
رمکلیا نے "ہرے رام گوری بولے"، کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ گائے دکھائی تو دی نہیں۔ لیکن رمکلیا نے اپنی پوری طاقت سے پکارا "گوری ہو گوری"۔
جواب آیا۔ "تو کاں آن ھ۔"
اور پھر باغ سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رمکلیا نے پھر پکارا۔ وہ اس کی طرف بولتی ہوئی بڑھی۔ لیکن دور سے ایک اور آواز آئی "اوماں آن ھ"۔ باغ کی آڑ سے بچھڑے کی آواز تھی۔ گائے اس کی آواز کی طرف گھوم پڑی۔ رمکلیا کا ننھا سا دل بیٹھنے لگا۔ وہ رات بھر رونے اور ہچکیاں لینے سے تھک چکی تھی۔ پھر بھی اپنی سکت بھر چلائی۔
"گوری ہو گوری۔
گوری ہو گوری۔
ادے گوری رے آئے جا۔
ہائے رے مئیا ناہیں آوت۔
گوری ہو گوری
گوری مئیں آئے جارہی۔"
لیکن گوری نے رخ نہ بدلا۔ البتہ دو چار دفعہ سر گھما کر رمکلیا کی طرف دیکھا۔ اڑاکر بولی اور پھر ادھر ہی تیرتی چلی گئی جدھر سے بچھڑے کی آواز آرہی تھی۔
باغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو بچھڑا اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آگیا جہاں سرِ شام وہ، اس کا بچھڑا اور بیل باندھے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کھیت تھا نہ جھونپڑی۔ جگہ وہی تھی لیکن اب سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ماں بچے کی آواز کا جواب دیتی تیرتی تیرتی

اس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی اُسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوتھنی بھی چاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی۔ مگر بچّہ نہ چلا۔ وہیں تیرتا رہا۔ گائے پھر لوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی۔ برابر آکر اپنی کمر اور پیٹ سے اُسے دھکیلا۔ ایک طرف چلی۔ بچّہ ساتھ نہ آیا تو پھر لوٹ آئی۔ اب وہ کچھ سمجھ گئی۔ بچّہ چھ فٹ نیچے زمین میں گڑے ہوئے کھونٹے میں رسی سے بندھا ہوا تھا۔ اور رسی بس اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح بچھڑے کی ناک پانی سے باہر تھی۔ لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو رسی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہوکر چلاتے بچّے کو وہیں چھوڑا اور پھر رمکلیا کی طرف رُخ کیا۔

رمکلیا رونے چلانے کی تھکن۔ ڈر خوف اور انتہائی ناامیدی کا اب تک برابر مقابلہ کرتی رہی تھی لیکن آخر آٹھ برس کی ننھی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے آکر کئی آوازیں دیں اور جب بھی رمکلیا کو ہوش نہ آیا تو پھر لمبی، کھردری گرم گرم زبان سے اس کا منہ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آگیا۔ پہلے تو ڈری، پھر گوری کو دیکھا "گوری میّا گوری میّا"، کہتی ہوئی اس کے گلے میں چمٹی۔ گوری نے دو پیر مارے، آگے بڑھی۔ رمکلیا چھت سے گھسٹ پانی میں آگئی۔ اس نے ڈر کے مارے پیر چلائے اور جھپٹ چمٹا کر گوری کی پیٹھ پر آگئی اور وہیں چھپکلی کی طرح لپٹی لپٹی چمپٹ گئی۔ گوری پھر بچھڑے کے پاس گئی۔ وہی حرکتیں پھر کیں۔ کئی دفعہ اس کے گرد چکّر کھائے اور چلی اور جب بچھڑا ساتھ نہ چلا تو پھر لوٹ آئی۔ اب رمکلیا کی بھی سمجھ میں آگیا تھا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی بچھڑے کے پاس گئی رمکلیا نے اوندھے لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ بڑھا کر بچھڑے کے گلے سے رسّی کی گانٹھ نکال دی۔ بچھڑا آزاد ہوگیا۔ گائے اور بچھڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ رمکلیا گائے پر چمپٹی ہوئی تھی۔ باغ اور ریل کی پٹری کی طرف سے دھارا چل رہی تھی۔ اس لئے یہ دونوں بہاؤ کی ہی طرف تیرتے چل دئے اور ڈھائی گھنٹے کے بعد بہت چکّر کھا کر پھر اسی ریل کی پٹری پر چڑھ آئے

لیکن جہاں گاؤں والے تھے تین میل دور پہ نکلے تھے۔ یہ سب بہت سویرے ہی چل دئے تھے اور جب گاؤں کے بہادر تیراک تیرتے ہوئے باغ میں آئے تو وہاں نہ بچھڑا تھا نہ رمکلیا تھی بلکہ مادھو کے مکان کا بچا کھچا حصہ بھی بہہ چکا تھا۔ دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری، بیٹھ پہ رمکلیا، پیچھے پیچھے بچھڑا" اوماں آں ھ" کے سوال جواب کرتے گاؤں والوں میں پہنچے تو ہلچل مچ گئی۔ لوگ مارے خوشی کے کودتے تھے۔ بسنتی خوشی کے مارے دھاروں دھار روتی ہوئی کبھی رمکلیا کو گلے لگاتی تھی کبھی بچھڑے کو اور کبھی گوری کے چمٹتی تھی اور گائے کہتی تھی۔" تم۔ ماں آں ھ۔ ہم ماں آں ھ۔"

آواز آئی۔" بول گوری مئیا کی جے۔"

پچاس آوازوں نے جے پکاری۔

پھر آواز آئی۔" بول گئو ماتا کی جے۔"

بچوں کا ادب

جن پر حکومت ہند نے مصنفین کو انعامات دئے۔

نجمی آپا اطہر پرویز ۷۵ء۱

مصنوعی چاند 〃 ۱٫۵۰

خلا کا سفر 〃 ۱٫۲۵

توانائی کا راز 〃 ۱٫۲۵

ستاروں کی دنیا 〃 ۲٫۰۰

بھارت دیس ہمارا دیس

جاوید اقبال ۱٫۰۰

ہماری آباد دنیا

فصاحت حسین ۱٫۰۰

برن کی کہانی (معلومات)

اطہر پرویز ۱٫۲۵

تیس مار خاں (بچوں کا ناول)

رشاہد علی خاں ۷۵ء

اکبر و بیربل کے لطیفے ۴۰ء

پتھروں کا مغنی

وحید اختر

(مجموعہ کلام) قیمت: چھ روپے

"وحید اختر کے کلام میں گہرائی، بلاغت اور معنویت ہے۔ فن کے نئے امکانات پر ان کی نظر ہے مگر انھوں نے عالمی کلاسیکی ادب سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ انھیں خوبیوں سے یہ مجموعہ ہماری شاعری میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ (پروفیسر آل احمد سرور)

"وحید اختر اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جو شاعری کی موروثی آبرو کا بھرپور لحاظ رکھتے ہوئے نئی زندگی کی تخلیقی عکاسی کرتے ہیں۔ میں نے ان کے مجموعے کو پہلے سے آخری صفحہ تک تامل کے ساتھ پڑھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وحید اختر "پتھروں کا مغنی" سے لیکر "صحرائے سکوت تک" یکساں طور پر کامیاب ہیں۔

(پروفیسر مجنوں گورکھپوری)

چند ادبی کتابیں

ادب اور زندگی (تنقید)

پروفیسر مجنوں گورکھپوری ۵/-

ادب کا مطالعہ (تنقید)

اطہر پرویز ۵/-

رقصِ بسمل (افسانے)

صدیقہ بیگم سیوہاروی ۲٫۷۵

دودھ اور خون (افسانے)

صدیقہ بیگم ۲٫۵۰

ہیولی اور چراغ (ڈرامے)

اطہر پرویز ۲٫۶۲

شرابی (ڈرامے)

اطہر پرویز ۶۵ء

ہماری سائنس

وزارت حسین ۲٫۰۰

ہماری مطبوعات

سائنس کے کرشمے وزارت حسین ۲٫۰۰ سائنس کی دنیا وزارت حسین ۲٫۶۴

اردو گھر ○ یونیورسٹی مارکٹ ○ علی گڑھ

جوش ملیح آبادی

رُباعیات

رقصاں ہیں تجلیات میرے دل میں
در آئیں صفات و ذات میرے دل میں
جیسے مُٹھی میں صرف اک ذرۂ خاک
یوں بند ہے کائنات میرے دل میں

جب ذہن میں افکار اُبل جاتے ہیں
تو قالبِ اطلاق میں ڈھل جاتے ہیں
دیکھا ہے کہ، بارہا، خیالات کے پاؤں
کونین کی چادر سے نکل جاتے ہیں

کتنے ہیں بھنچے بھنچے دو عالم کے حدود
دم بھر میں ہبوط ہے تو پل بھر میں صعود
سینے میں اُلجھتی ہے خیالات کی سانس
اُف تنگ، بہت تنگ ہے تشریفِ وجود

جب دہر میں پہنائی نہیں پاتی ہیں
کس درجہ ترنگیں مری گھبراتی ہیں
انگڑائی جو لیتے ہیں خیالات مرے
تو کہنیاں قطبین سے ٹکراتی ہیں

ن۔م۔راشد

مُسکراہٹیں

مُسکراہٹیں ہیں وہ کرم کہ جس کا ریشہ
استوارِ ازل میں ہے
ابد بھی جس کے ایک ایک پَل میں ہے
کبھی ہیں سہوِ گفتگو،
کبھی اشارۂ خرد، کبھی شرارۂ جنوں
کبھی ہیں رازِ اندروں
وہ مُسکراہٹیں بھی ہیں کہ پارہ ہائے ناں نہیں
وہ مُسکراہٹیں بھی ہیں کہ برگِ زر فشاں نہیں
کبود رنگ، زرد رنگ، نیلگوں
کبھی ہیں پیشہ ور کا التہابِ خوں
کبھی ہیں رَس، کبھی ہیں مے
کبھی ہیں کارگہ کا رنگِ نَے
کبھی ہیں سنگِ رہ
کبھی ہیں راہ کا نشاں
کبھی ہیں پشت پا پہ چوربن کے گامزن

کرشن موہن

تین نظمیں

طلوعِ صبح

منظر میں طلوعِ صبح کا
جیسے کوئی نازنیں
چاہنے والے کی خاطر کھول دے سینے کے بند

اُمید — ایک رقاصہ

اُمید ہے اک رقاصہ
جو میرے ریاضِ دل میں
دن رات ریاضِ رقص کیا کرتی ہے

جو پائے کمالِ فن بس اِک لگن میں
رہتی ہے اُداس ہمیشہ وقت پیشہ
محوِ فکر و اندیشہ

اُمید — ایک غزالہ

اُمید ہے ایک غزالہ
خوشبوئے بدن کا پیالہ
پی کر رہتی ہے رقصاں
پھرتی رہتی ہے قلانچیں دشتِ جنوں میں
اپنے ہی رنگ و فسوں میں

انور معظم

بازار

صاف ستھری کشادہ سڑک
خوب صورت دکانیں کھلی
شوخ شوکیس سنورے سجے
روشنائی، کتابیں، قلم
علم، تہذیب، مذہب، ادب
ریڈیو، پمفلٹ، پوسٹر
سیکڑوں تیز قدموں کا شور
کاریں، رکشائیں، بوجھل بسیں
سیٹیاں، ہارن، پہیے، دھواں
ٹائروں کی رگڑ
۔۔۔۔ چیخ
۔۔۔۔ خون ...
۔۔۔۔ ایک سسکی
۔۔۔۔ کئی قہقہے ...!

تاج مہجور

بیوقوف لڑکی

میں نے اُس بے وقوف لڑکی کو
چاند کی سمت تکتے دیکھا ہے
جس کے پریمی نے یہ کہا تھا اُسے
تم سجل چاندنی کی کرنوں میں
میرا سندیسہ پڑھ لیا کرنا
جب کرن تھرتھرائے پھولوں پر
میری سرگوشیاں سنا کرنا

چاند چھپنے کو ہے گھٹاؤں میں
اور دھندلکے کی آمد آمد ہے
کوئی اُس بے وقوف لڑکی سے
جا کے کہہ دے کہ اس دھندلکے میں
جو ترے پھول جیسے چہرے کو
تھام لے اپنے گرم ہاتھوں میں
اور سرگوشیاں کرے تجھ سے
وہ کوئی ہو! ترا پریمی ہے
چاند کو دیکھنے سے کیا حاصل؟

بلراج کومل

موجِ رواں

وہ لوگ جو دیکھنے کے عادی ہیں
چاند میں عکس
خوبرو، پُر جمال، طرار لڑکیوں کے
یا ترک کر دیں گے ـــــ رسم کہنہ موازنہ کی
یا راستہ کوئی دوسرا، ایک روز شاید، تلاش کر لیں گے
جانے پہچانے زاویوں سے
اگر وہ صدیوں پرانا رشتہ نہ توڑ پائے

حسین چہروں کو آئینہ ـــــ چاند کل تلک تھا
اندر آج باقی ہے صرف شفاف بہتا پانی
ہر ایک نقشِ جمیل پر ـــــ صبح و شام
سایہ فگن ہے موجِ رواں
سیہ چوٹیوں پہ اب آسماں
کی فریاد اپنے غم کا فسانہ پیہم سُنا رہی ہے
ندی میں سیال برف بہتی ہے
کون جانے !
وہ کون سی سمت سے مرے پاس آرہی ہے
مجھے کنارے کی ریت پر چھوڑ کر
کسی اجنبی اُفق کی تلاش میں دور جا رہی ہے

زبیر رضوی

پرایا احساس

تم کس سوچ میں ڈوب گئی ہو

ہاتھ کا پتھر
پانی کے سینے پہ مارو
چوٹ تو پانی کے آئے گی
پانی چوٹ کی تاب نہ لا کر
موجوں کی صورت میں بہتا
ساحل ساحل سر ٹپکے گا
پھر خود ہی
اصلی حالت پہ آ جائے گا
تم کس سوچ میں ڈوب گئی ہو
ہاتھ کا پتھر
پانی کے سینے پر مارو
میں پانی ہوں !!

ندا فاضلی

دو سہیلیاں

بیٹھے بیٹھے اُوب رہے ہیں آؤ سہیلی سرپٹ بھاگیں
سر کے بال تلک ہل جائیں، دھم دھم یوں زمین پر لانگیں

گھٹنوں گھٹنوں تال میں چل کر مُنہ مُنہ تک گاگر بھر لائیں
اور نشانے تاک تاک کر پتھر سے پتھر ٹکرائیں

برگد کی ننگی ڈالی پر، بن جھولے کے ایسا جھولیں
لوکٹ چٹلے میں پھنس جائے، انگوٹھے پیشانی چھو لیں

ہنسی ہنسی میں اک دوجے پر بدلی بن بن کر یوں ٹوٹیں
آٹے جیسا گس کر گوندھیں کئی جگہ سے ٹوٹیں پھوٹیں
بیٹھے بیٹھے اُوب رہے ہیں

سیّد فضل المتین

انتباہ

مثلِ موجِ ہوا
عمر کی منزلوں سے گذرتا ہوا
زندگی کو پرکھتا، سمجھتا ہوا
شہر در شہر بھٹکا ہوں میں!
جب لکھوں گا کبھی — داستانِ سفر
کتنے پُر پیچ، کھوئے ہوئے راستوں کے نشاں
جگمگائیں گے پُر نور ہو جائیں گے
کتنے معروف، گم کردہ رہ — راہبر
نامور ہو کے بے نام ہو جائیں گے
کتنے معصوم، انجان، گم راہرو
جاوداں ہوں گے — مشہور ہو جائیں گے
اور
اس داستانِ سفر کا کبھی —
ذکر چھیڑیں گے، جب — ہم سفر
اپنے انداز میں —
رہ نہ پائے گی اک بات بھی راز میں!

انور سدید

زمین

زمین جو لمحوں کی ٹوٹی مالا کے گرتے موتی نگل رہی تھی
اسی زمیں سے حیات پھوٹی
اسی زمیں کا خمیر سیّال خون بن کر
مری رگوں میں بہا تو میں نے
عظیم تر کُل کا بھید سمجھا
عظیم تر کُل کا راز پایا

زمین رازوں کا ایک معبد
زمیں شراروں کا ایک مدفن
میں اس کی باہوں میں ایک بالک
وہ میری آنکھوں میں اک ستارہ
زمیں مری زندگی کا منبع
زمیں مری آرزو کا ماخذ

زمیں جو سورج اُگل رہی ہے!!

شہریار

ایک نظم

تھکی ہوئی آہٹوں کے ہاتھوں نے
بند آنکھوں پہ دستکیں دیں
حصارِ تنہائیوں کا توڑا
ہوا میں کچھ رنگ سے اُڑائے
خلا میں کچھ دائرے بنائے
کسی کی زلفوں کے خم سنوارے
کسی کے چہرے کے دُھندلے دُھندلے
نقوش مہتاب میں اُبھارے
اُدھر کسی شاخ کو ہلایا
اِدھر کسی آبِ جو کو چھیڑا
یہاں وہاں کچھ چراغ رکھے
تمام شب غم گساریاں کیں
تھکی ہوئی آہٹوں کے ہاتھوں نے
بند آنکھوں پہ دستکیں دیں

احمد وصی

کاغذ پہ پھیلا ہوا جھوٹ

وہ ایک اونچائی پہ کھڑا تھا
بہت بڑی سی ـــ یہ پھیلی دُنیا
اُسے بہت مختصر لگی تھی ـــ وہ سوچتا تھا
چمکتی سڑکوں پہ چلتی کاریں
(جو کیڑوں جیسی رینگ رہی ہیں)
یہ بلڈنگوں کی اُٹھان ـــ جس کے
قریب ہی میں کھڑا ہوا ہوں
اور اپنا قد اُن سے ناپتا ہوں
یہ سب مرے پاؤں کے تلے ہیں
وہ اس قدر خوش ہوا کہ پل میں
اسی بلندی سے نیچے آیا
وہ چلتے لوگوں میں مل گیا تھا

اور اس کا جسم
ایک فٹ پاتھ پہ پڑا تھا
یہ دوسرے دن کے سارے اخباروں کی خبر تھی
"شہر کے اک لکھ پتی نے گر کر خود اپنی بلڈنگ سے جان دیدی
یہ خودکشی کی وجہ لکھی تھی
کہ کوئی صدمہ اُسے ہوا تھا"

منظر سلیم

لاش کی التجا

مجھے یہاں سے اُٹھاؤ لوگو
نہیں، نہیں ـــ اب مجھے اُٹھانا
اُٹھا کے چلنا ـــ گراں بھی ہوگا
تمھارے کپڑے بھی خون سے داغدار ہوں گے

سُنو مرے پاس آؤ
بے جان ہاتھ تھامو
گھسیٹتے لے چلو یہاں سے
مجھے مرے گھر کے سامنے ڈال آؤ لوگو
زمیں کے اوپر ـــ یہ آخری رات
گھر کے نزدیک ـــ کاٹ لوں میں
نہیں۔ نہیں، یوں بھی ہوگی زحمت
گلی ہے تاریک
وقت کم فاصلہ بہت ہے
پھر اس کا بھی کیا یقیں کہ بچے
ابھی نہ سوئے ہوں ـــ ان کی آواز
میرے کانوں تک آ ہی جائے
نہیں۔ نہیں۔ میرے گھر کی جانب نہ جاؤ لوگو!

اردو کے چار بہترین ناول

ایک ہی ایڈیشن ناولٹ نمبر میں

۱۔ کمیں گاہ
شوکت صدیقی
۲۔ چراغِ تہہ داماں
اقبال متین
۳۔ کیمیائے دل
جیلانی بانو
۴۔ آتشِ رفتہ
جمیلہ ہاشمی

شاہکار

اور

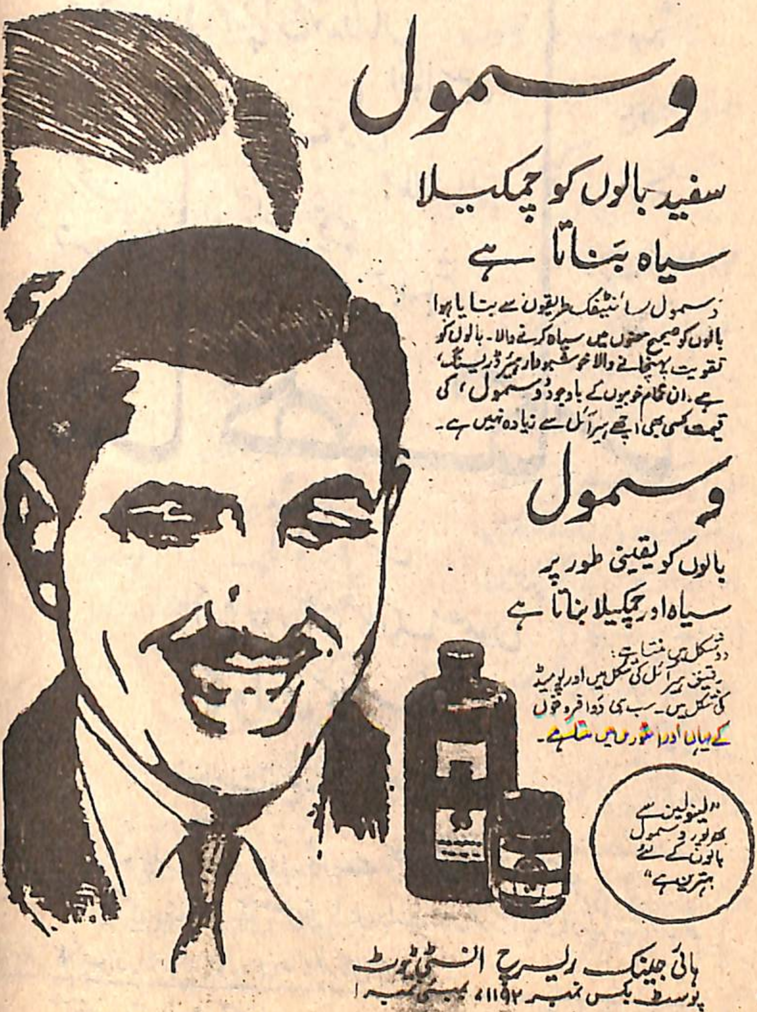
ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مضمون
ناولٹ کا مسئلہ

ضخامت: پونے چار سو صفحات

صرف چار روپے منی آرڈر سے بھیج کر طلب کیجئے

یا ۲۰ر۱۲ روپے بھیج کر شاہکار کے مستقل خریدار بن جائیے۔ اس طرح آپ کو ناولٹ نمبر کے ساتھ شاہکار کا ایک اور خاص نمبر اور دس عام نمبر بھی ملیں گے۔

منیجر شاہکار۔ نمبر ۱۳۴ بخشی بازار، الہ آباد ۳


وسمول
سفید بالوں کو چمکیلا
سیاہ بناتا ہے
وسمول سائنٹیفک طریقوں سے بنایا ہوا
بالوں کو صحیح معنوں میں سیاہ کرنے والا۔ بالوں کو
تقویت پہنچانے والا خوشبودار ہیئر ڈریسنگ،
ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود وسمول، کی
قیمت کسی بھی اچھے ہیئر آئل سے زیادہ نہیں ہے۔
وسمول
بالوں کو یقینی طور پر
سیاہ اور چمکیلا بناتا ہے
دو شکل میں ملتا ہے:
رقیق ہیئر آئل کی شکل میں اور پومیڈ
کی شکل میں۔ سب ہی دوا فروشوں
کے یہاں اور اسٹوروں میں ملتا ہے۔
"لینولین سے
بھرپور وسمول
بالوں کے لئے
بہترین ہے"
ہائی جینک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲، بمبئی نمبر ۱

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

شاذ تمکنت

جدید تر اُردو شاعری کے اُفق پر شاذ تمکنت ایک روشن ستارے کی طرح نمودار ہوئے اور دیکھتے دیکھتے اس ستارے کی درخشانی نے پڑھنے والوں کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ ان کی نظموں میں ایک رچا ہوا غنائی اور جمالیاتی احساس ملتا ہے جو ان کے مجموعے "تراشیدہ" میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مجموعے کا عنوان خود اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ شاذ اپنی نظموں میں جس معیار کو سامنے رکھتے اور حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ایک مناسب ترشے ہوئے اور ہشت پہلو ہیرے کا تصور ہے۔ رنگ و آہنگ، صورت و معنی اور خطوط اور آوازوں کی جیسی یکجائی اور بوقلمونی ان کے ہاں ملتی ہے وہ ان کے ہم عمر اور ہم عصر شعراء کے ہاں کم تر ملے گی۔

شاذ تمکنت ایک موضوعی شاعر ہیں اور رومان پسند شاعر کی ساری جذباتیت، تشنگی اور اُداسی اور اپنی محبوبہ سے ہم آہنگی اور قربت کی خواہش ان کے یہاں رہ رہ کے جھلک اُٹھتی ہے۔ انھوں نے خارج سے عائد کئے ہوئے کسی نظریئے کی پابندی کو اپنے لئے گوارا نہیں کیا ہے بلکہ اپنے احساسات کے آئینہ کو ذاتی ردِّ عمل کے ذریعہ جِلا دی ہے لیکن غالباً یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کے یہاں صرف تشنگی اور اُداسی ملتی ہے۔ اس کے برعکس ان کے یہاں ایک رنگ اور گہرا رنگ سرشاری اور لطف و انبساط کا بھی ہے۔

ان کے یہاں وہ تلخ کامی یا زہرناکی بالکل نہیں جو اس دور کے شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ وہ اپنی محبوبہ سے جس جذباتی اتصال اور خوئے دلنوازی کی امید رکھتے ہیں وہ اکثر پوری بھی ہوتی ہے۔ شاذ کے یہاں ذاتی معاملات کے ڈرامے کا یہ پہلو اہم ہے یہ نسبتاً شروع کی ایک نظم میں محبوبہ کے خدوخال کی تصویر یوں پیش کرتے ہیں۔

سیپ کی پوریں ہتھیلی کی مصفّا چاندی
پاؤں میں چھاگلیں، تاروں کی جبیں پہ مہتاب
زلفیں بل کھائی ہوئی، یوگ کی مچلی ہوئی رین
صندلی باہوں کا بلّور، مژہ، پارۂ خواب
اوس کی پیاس سے کھلتی ہوئی ہونٹوں کی کلی
رس سے چھلکی ہوئی باتوں کی چھنکتی جھانجھن
دہکے دہکے ہوئے رخساروں کے مہکے کہرے
آنکھ کی جوت میں ہے قوس قزح کا روغن

(نیند کی وادی میں)

اس نظم کی مرصّع کاری میں ایک اچھوتا پن ہے جو ہمیں چونکاتا ہے۔ رنگ اور آوازوں کے سنجوگ سے جو نقش بنایا گیا ہے وہ قطعی اور مکمل ہے اور اس میں نیند کی طلسماتی دنیا کا دھندلکا بھی شامل ہے۔ شاذ ان اوہام کا فکر کرتے ہیں جو اکثر ٹوٹتے رہتے ہیں اور ان گریزپا لمحات کی یاد بھی انھیں ستاتی ہے جن پر ماہ و سال کی گرد جم گئی ہے۔ وہ اپنی محبوبہ سے ایک نرمی، طہارت اور غیر مرئی پاکیزگی کا تصوّر وابستہ کرتے ہیں لیکن خوابوں کے یہ شیش محل کبھی کبھی چکنا چور بھی ہو جاتے ہیں اور آدرشوں کے خول سے نکل کر جب وہ حقائق کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو آئیڈیل اور حقیقت کا یہ تصادم ان کے لہجہ میں ہلکی سی افسردگی پیدا کر دیتا ہے اور شاید تجسس پر بھی اکساتا

ہے۔ ان کے ہاں تلخی نہیں، استعجاب ہے، سینہ کوبی نہیں اپنے زخموں کی بہار دکھانے کا عزم اور حوصلہ ہے اور دل گرفتگی کے باوجود ایک بشاشت، امید آفرینی اور سکون ہے۔

شاذ تمکنت کی شاعری میں بہ حیثیت مجموعی دو عناصر غور طلب ہیں، اول محاکات (Images) کی تزئین و آرائش اور دوسرے لمسیاتی احساس۔ ارسطو نے کہا تھا کہ استعاروں پر شاعر کی قدرت اس کی فطانت کی دلیل ہے۔ کالرج کے نزدیک نئے اور جاذب توجہ محاکات کا استعمال بڑے اور ہمہ گیر شاعر کا نمایاں امتیاز ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ احساس کی شدت کے مطابق ان میں رد و بدل کیا جائے۔ شاعری تجریدی کی دھند ہے اور گو شاعری میں ایسی تعیمات بھی جو صدیوں کے مشاہدے اور تجربہ کا نچوڑ ہیں، جگہ پاتی ہیں لیکن اس کی روحِ رواں وہ تصویریں ہیں جو تجربے کی تجسیم میں معاون ہوتی ہیں۔ ان لفظی تصویروں کے ذریعہ جن میں ایک حسّی عنصر ہوتا ہے تخیل کے عمل کی وہ کارفرمائی سامنے آتی ہے جو شاعری کے مواد میں گرمی، توانائی اور چمک پیدا کرتی ہے۔ احساسات کو گویا بنانے کے لئے ان مدرکات کا سہارا لینا پڑتا ہے جو گرد و پیش کی دنیا میں موجود ہیں۔ شاعری میں محاکات کی موجودگی سے دو چیزوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اوّل شاعر کا ذہنی عمل اور دوسرے اس کی غالب نفسیاتی کیفیت۔ محاکات کا اہم ترین وظیفہ تجربے اور مشاہدے کی کلّیت کو مجروح کئے بغیر اسے پڑھنے والوں تک پہنچا دینا ہے۔ ایسی لفظی تصویروں کی نمایاں خصوصیات صفائی، موزونیت اور انکشاف ہیں۔ انھیں ایک شیشہ تو سمجھئے جس کے ذریعہ شاعری کا پیچیدہ مرکب چشم زدن میں گرفت میں آجاتا ہے۔ محاکات کے استعمال کی بنیاد اور اس کا جواز خارجی اور داخلی حقیقت یعنی اشیاء اور احساسات کے درمیان ربط قائم کرنا ہے اشیاء ایک دوسرے سے لاتعلق نہیں ہیں بلکہ وابستگیوں کے تانے بانے کا نام ہی داخلی حقیقت ہے۔ اسی طرح احساسات بھی اپنا سیاق و سباق رکھتے ہیں۔ ہمارے

قدیم شاعروں کے یہاں شاعری کو پیکر نگاری کے مترادف سمجھنے کی طرف میلان نہیں تھا۔ یہ فنی تدبیر ایک ماقبل منطق (Pre-logical) اندازِ نظر کی ترجمانی کرتی ہے کیونکہ جیسا کہ Vico نے کہا ہے انسان نے مترنم آوازیں پہلے نکالیں، اپنے مافی الضمیر کو مرتب اور منضبط انداز میں ظاہر کرنا بعد میں سیکھا۔ ترسیل اور ابلاغ کا موثر ترین وسیلہ اور اشیاء اور احساسات کے درمیان ایک اندرونی رشتہ کو جو ناگزیر بہ ضرورت کا پابند ہے ظاہر کرنے کی تدبیر محاکات ہی ہیں۔ انھیں کے ذریعہ تجربہ اپنی تمام تر جسمانیت کے ساتھ گرفت میں آسکتا ہے۔ شاذ تمکنت کے یہاں محاکات کی چند مثالیں دیکھئے:

سوکھے سوکھے ہوئے جھڑتے ہوئے پتّوں کی کراہ
رقصِ آواز کہ بہتی ہوئی چاندی کی ندی
گھلا گھلا سا ہے لالہ کی آنکھ کا کجرا
چاندنی خستہ و درماندہ کھڑی ہے خاموش
نقرئی گرد میں چپ چاپ کھڑے ہیں اشجار
رہ گزر نیند بھری آنکھوں سے یوں تکتی ہے
آبلہ ہائے کفِ پا سے جل اُٹھتے ہیں چراغ
پتّی پتّی پہ کفِ پائے قمر دیکھا ہے
یہ لہو روتی ہوئی شاخِ حنا کیسی ہے
چاند کے سینہ میں لَو دیتا ہے سنگیت کنول

اور یہ کہا گیا ہے کہ محاکات یعنی لفظی تصویروں میں ایک حسیّاتی عنصر ہوتا ہے، ہم محاکات کو عام طور پر سامع یا باصرہ لوازہی سمجھتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ علیحدہ علیحدہ اور بیک وقت بھی تمام حواس کو متاثر کر سکتے ہیں۔ شاذ تمکنت کے یہاں لمسیاتی احساس خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ وہ نقوش کو ابھارنے میں صرف رنگوں کے امتزاج یا آوازوں کے

تال میں ہی سے کام نہیں لیتے بلکہ اِن کا ادراک چھو کر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی جذبے یا احساس کو مجسم کر دینے سے ہم ایک سیّال اور سیمابی کیفیت کو لفظوں میں اسیر کر لیتے ہیں۔ ایسے متعدد محاکات کو جو متخالف حواس کو آسودہ کریں ایک دوسرے سے متعلق کرنا اور ان میں ایک ترتیب قائم کرنا یقیناً ایک دشوار کام ہے۔ اس کیمیاوی عمل کی چند مثالیں دیکھئے:

لب بستہ فسردہ چاندنی میں
میداں کے سلگتے حاشئے پر
اک اونگھتے مقبرہ کے اندر
آنسو کا چراغ جل رہا ہے

(کھنڈر)

پھر تم کو ملے گی دل کی سرحد
آہستہ گذرنا اس جہاں سے
یہ کانچ کا قصر قرمزی ہے
یہ سیج شفق کے پھول کی ہے
یہ نقرئی جوئے نغمگی ہے
مندر ہے یہ زخم کی ہنسی کا
جب گذروگے اس کے نقشِ پا سے
سجدوں کے تمھیں نشاں ملیں گے
ان مِٹتے نقوش سے یہ کہنا
اب میری جبیں، جبیں نہیں ہے
اک سنگِ مزار بن گئی ہے

(اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو)

دھوپ کرنوں میں پروئے ہوئے شبنم کے نگیں
پُرسشِ درد کو چُپ چاپ چلی آئی ہے

(شبِ رفتہ)

ڈالیاں اوس کی بوندوں سے لدی جاتی ہیں
چاندنی کوہ کے ماتھے سے اُتر آئی ہے

یہ چٹانیں یہ تراشیدہ نگیں فطرت کے

(آخرِ شب)

جب کرن آتی ہے پابوسیِ شبنم کے لیے
جگمگا اُٹھتے ہیں وجدان کے طاقوں کے دیئے

(میرافن میری زندگی)

چاندنی کی نیم خوابیدہ اُداسی کا فسوں
بام و در کے مضمحل شانوں پہ تھک کر سو گیا

(خرابہ)

ابھی پچھلے پہر آتی ہیں آوازیں سرابوں کی
ہتھیلی سے کوئی ملتا ہے آنکھیں میرے خوابوں کی

(دوسری محبت)

اس کے ساتھ وہ ترکیبیں بھی قابلِ غور ہیں جو شاذ تمکنت کے شفاف تخیل نے تراشی ہیں اور یہ اکثر فراق اور فیض کی یاد دلاتی ہیں۔ چند ترکیبیں یہ ہیں :
نیلم کے نگینے، چھنکتی جھانجھن، سیّال۔ گلابی لہراؤ، طلائی پھانکیں، التفات کے برگ، سپردگی کی چھاگل، محرابِ شکستِ آرزو، رسمسے آنچل

روپ سنگھار، گلِ التفات کی مہکار، دہلیز خزاں، کہکشاں کا لچکا شبِ التفات لگاوٹ کی شبنم، مریمِ نغمہ یہ ترکیبیں کسی قدر نامانوس ضرور ہیں لیکن ان میں ایک ندرت اور دل کشی ہے۔ یہاں بھی تجریدی تصورات کو جسم و جان عطا کرنے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔ مندرجہ ذیل مصرعوں میں فراق کا رنگ خاصا نمایاں ہے۔

- رات نیندوں کے شبستاں میں چھپا کا سا ہوا
- ذہن کے رمنوں میں غنچوں کی مہک اترے گی
- جھوم جھوم اٹھتی ہے لہرائی ہوئی چندر کرن
- دیدنی ہے مری آواز کی جھنکار کا رنگ
- جواں ہیں وحشتیں ارماں کے مرگ نینوں کی
- خمِ محرابِ لب میں پیاسی آنچیں سنسناتی ہیں
- رس میں ڈوبے ہوئے مدماتے جھکورے مہکے

بعض جگہ فیض کا اثر لہجے پر صاف نظر آتا ہے۔

اے یادِ خزاں کے نرم جھونکو
ایوانِ نگار تک پہنچ کر
چوکھٹ پہ لٹا کے میرے آنسو
اس جانِ وفا سے اتنا کہنا
بوئے تھے جو انبساط کے بیج
اب اشک کی فصل بن گئے ہیں

(اے یادِ خزاں کے نرم جھونکو)

یہاں یہ اضافہ کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ ایک پوری نظم 'قیدِ حیات و بندِ غم'، فیض کے سحل کھرے ہوئے اور روشن انداز کی ایک بھدی اور ناکام شکل ہے۔

تصویروں اور آوازوں کی اہمیت پر زور دینے سے شاذ تمکنت کبھی نہیں چوکتے۔ اُسی کا ایک دوسرا پہلو سنگیت (جو آوازوں کی یکجائی اور دانست کا دوسرا نام ہے) کی وہ دل کشی ہے جسے وہ اکثر محسوس کرتے ہیں۔ موسیقی کو کائنات اور انسانی شخصیت کے عناصر میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے کے لئے رمز کے طور پر ہمیشہ استعمال کیا گیا ہے۔ یونانی فلسفی پائی تھی گوراس نے سب سے پہلے اس نظریہ کو پیش کیا۔ اساطیری نظام میں بھی اسے خلفشار اور مزاج پر فتح پانے کا ایک لطیف راز مانا گیا، اس کا جو وظیفہ ارض وسما کی گردش کو منضبط کرنے کے سلسلے میں تسلیم کیا گیا وہی انسانی نفسیات کی تطہیر اور استقلال کے لئے بار بار تصور کیا گیا۔ شاذ تمکنت کے شعری مزاج میں موسیقی کی یہ جگہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ وہ اس کی مرکزی اہمیت کے قائل ہیں شاعری اور موسیقی یوں بھی ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ الفاظ جب مکانی (Spatial) طور پر استعمال کیے جاتے ہیں تو وہ شاعری کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور جب زمان کی پیمائش (Dimention of Time) ان پر عائد کی جاتی ہے تو وہ موسیقی کا روپ دھار لیتے ہیں۔ لیکن حرف و صورت بہر حال شعر اور موسیقی دونوں کے لئے ضروری ہیں۔ اور حروف کائنات کے ضمیر میں اُتر کر اس بحران اور انتشار کو قابو میں لانے میں مدد دیتے ہیں۔ جن سے شاعر برابر دست و گریباں رہتا ہے۔

پردۂ ذہن پر میں نے محسوس کی
ایک چمکیلی بہتی ہوئی راگنی
چاپ نغمات کی سرسراتی گئی
میری رگ رگ میں شمعیں جلاتی گئی
یک زباں ہو کے نغموں نے مجھ سے کہا

سُن شہیدِ ستم ہائے صبح و مسا،
ہم ترے چاکِ داماں کے ہیں بخیہ گر
ہم ہیں تیرے مسیحا ترے چارہ گر
تیرے فانوسِ خاطر میں شعلہ ہیں ہم
مو بہ مو صورتِ جوشِ صہبا ہیں ہم

(نغموں کی مسیحائی)

میں نے ہر رنگ میں سنگیت کی پوجا کی ہے
آسرا کس کا تھا نغمات کے دامن کے سوا
سوچتا ہوں کہ اگر سُر نہ سہارا دیتا
دوش پر وہ غمِ دوراں کی گرانباری تھی
سانس اُکھڑ جاتی مری تھک کے کہیں سو جاتا
ریزۂ آسیۂ شام و سحر ہو جاتا
نسبت درد ہے کچھ جنبشِ مضراب کے ساتھ
کوئی چھپ چھپ کے بلاتا ہے پسِ پردۂ ساز
مجھ سے یہ کس نے کیا سات سروں کا پردہ
میرے دکھ درد کا یہ کون شناسائی ہے
کون غم خوار ہے یہ کس کی مسیحائی ہے

(مریم نغمہ)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیقی شاذ کے لئے تزکیۂ غم اور توازن حیات کو حل کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔

لیکن انسانی فن کے تکملہ کے طور پر شاذ تمکنت کے یہاں فطرت حُسن کی عکاسی بھی اپنے لئے ایک جگہ رکھتی ہے اور یہ ان کی شاعری کا ایک دل کش پہلو ہے۔ وہ ان معنوں میں فطرت کے حسن کے روشناس نہیں ہیں جیسے جوش ہیں۔ شاذ کے ہاں کردار نگاری اور داخلی کیفیات کی عکاسی کو فطرت کے آئینہ میں اُبھارا گیا ہے۔ یہاں بھی مصوری مسلسل نہیں بلکہ وہ سرسری جلوے ہیں جو حسن رہ گزر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس پس منظر میں واردات قلبی کا بیان ایک وسعت اور ہمہ گیری حاصل کر لیتا ہے اور ایک نکھار، تازگی بھی۔ فطرتِ انسانی احساسات کو جلا بھی بخشتی ہے اور ان کی شدت اور تندی کو متوازن بھی بنا دیتی ہے۔ بے نام اشیا تخئیل کے اس عمل سے نام پا لیتی ہیں اور مبہم جذبات اور احساسات کو تازگی اور قطعیت حاصل ہو جاتی ہے۔ دراصل انسانی فن اور فطرت کے بے پایاں حسن اور اس کے امکانات کے درمیان کوئی تصادم یا تضاد نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں۔ اس حُسن آفرینی کا ثبوت ان دو تراشوں سے ملتا ہے۔

چاند لچکاتا ہے کرنوں کے چمکتے ہوئے تیر
کس سوئمبر کے رچانے کا تمنائی ہے
رسمسے جنگلوں کی نیند میں ڈوبی ہوئی لے
رگِ منظر میں فضائے دلِ شب بولتی ہے
ادھ کھلے غنچوں میں شبنم کی تری ڈولتی ہے
یہ فضا رس بھری کلیوں کی گرہ کھولتی ہے
یہ خنک رات ستاروں کے گھُنگرو رولتی ہے
سانولی چاندنی مدماتی چھلک پڑتی ہے
ان ہواؤں میں گلابی سی چھلک پڑتی ہے

(آخرِ شب)

جب شفق، اپنے ہی دامن میں لگائے ہوئے آگ
رقص کرتی ہے تو چھڑ جاتے ہیں احساس کے راگ
جب شبِ ماہ دلِ غنچہ میں دَر آتی ہے
برگ میں نُطق کی تاثیر نظر آتی ہے
میں نے مہتاب سرِ شاخ و شجر دیکھا ہے
پتی پتی پہ کفِ پائے قمر دیکھا ہے

(میرا فن میری زندگی)

شاذ تمکنت کے یہاں محبوبہ کا جو کردار ملتا ہے وہ ان کے عام خیالات سے ہم آہنگ ہے۔ یہ عورت متوسط طبقہ کی عورت ہے جو سماج کے مروّجہ قوانین اور رسم و رواج کی پابند ہے اور اپنی ہی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ وہ پوری طرح آزاد نہیں ہے اور نہ اس میں انفرادیت کا وہ رچاؤ ہے جو موجودہ زمانہ کی عورت سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ محبت کے جو معاملات ان نظموں میں ملتے ہیں ان کا پس منظر ایک گھٹا ہوا سا رواجی ماحول ہے۔ اس میں شاعر اور اس کی محبوبہ کے درمیان ایک آزاد مکالمہ نہیں ہے اور نہ برابری کی وہ فضا ہے جو تہذیب کی ترقی سے ہم آہنگ ہیں۔ عشق و محبت کے مروّج انداز کے خلاف یہاں بھی مرد کی فوقیت مسلّم ہے اور یہاں شاعر اپنی تمناؤں کی آسودگی کے سلسلہ میں مختلف انداز سے جواز ڈھونڈھتا رہتا ہے۔ محبوبہ کا جو سراپا شاذ نے پیش کیا ہے اسے حد درجہ (Stylized) کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی مرصّع کاری میں جو شعوری اہتمام ہے اس سے اس کی تاثیر کم ہوجاتی ہے۔

دہکتے عارضوں پر پَو پھٹے کا عکس لرزاں ہے
شنگرفی بازوؤں میں جیسے آتش زار یوناں ہے
ز سرتا پا نکلتی ہیں سجل بانکی شعاعیں سی
کہ جیسے ہشت پہلو پارۂ نیلم کی ضَو تابی

ہر اک خطِ بدن میں بجلیاں سی ڈوب جاتی ہیں
خمِ محرابِ لب میں پیاسی آنچیں سنسناتی ہیں
کفِ دستِ بلوریں پہ حنائی رنگ سامانی
جواہر کی دکاں میں جس طرح ہیروں کی مہمانی
مبارک ہو گھنی زلفوں کو گلبانگ اماں ہونا
زمانہ کی کڑی دھوپوں میں مثلِ سائباں ہونا

(دوسری محبت)

مگر یہاں بھی رنگوں کی گل کاری قابلِ توجہ ہے۔ اس کے برعکس ایک اور موقع پر محبت میں ناکامی کے تجربے کو بیان کیا ہے۔ یہاں تجربہ اور صورتِ حال کو ایک دوسرے میں پیوست کیا گیا ہے۔ یہ تصویر حد درجہ کامیاب ہے۔ اس میں احساسات اور جذبات میں زیادہ ٹھہراؤ ہے اور ذہن اور روح پر جو کیفیت حاوی ہے اسے فضا آفرینی کے توسط سے ابھارا گیا ہے۔ نظم شروع بھی ایک مکالمہ سے ہوتی ہے۔ اشعار قابلِ ذکر ہیں:

سنگ باری میں یہ شیشے کا مکاں کس کا ہے!
اس در و بام میں خوشبوئے وفا کیسی ہے
کس کی آواز سے دیواروں کے سینے ہیں فگار
میرے معبود مرے گھر کی فضا کیسی ہے
چھاؤں دیتے نہیں آنگن کے گھنیرے اشجار
غم کی چھائی ہوئی گھنگھور گھٹا کیسی ہے
ایک کونپل پہ تھا انگشت حنائی کا نشاں
یہ لہو روتی ہوئی شاخِ حنا کیسی ہے

کس کی تصویر ہے جس پہ یہ گماں ہوتا ہے
جانے کب بول اُٹھے اُف یہ ادا کیسی ہے

(بے ننگ و نام)

شاذ تمکنت بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کی آب و ہوا مروجہ اور رسمی ہی سہی، ان کے لہجہ میں عام طور پر وہ رچاؤ اور تیکھا پن نہیں جو ان کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے، اسکی وجہ شاید یہ ہو کہ غزل کا فن انتہا درجہ کی دروں بینی اور جذبہ کی کشید چاہتا ہے شاذ تمکنت کی نظموں میں نقاش کا موقلم بہت نمایاں ہے۔ غزلوں میں یہ نقوش پھیکے ہیں اور باوجود کوشش ان کی تہ میں احساسات اور جذبات کی وہ پختگی اور کڑھت نہیں تلاش کی جاسکتی جس سے اچھی غزل پہچانی جاتی ہے۔ غزل پہ یہ الزام کہ اس میں ذہنی کیفیت کا انتشار پایا جاتا ہے صحیح نہیں ہے۔ غزل کی شاعری میں خاص طور پر منطقی تسلسل کی نسبت ہمہ گیر نفسیاتی کیفیت کی موجودگی اور جذباتی تسلسل زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ تسلسل اندرونی بھی ہو سکتا ہے۔ شاذ نے چند کامیاب غزلیں بھی کہی ہیں۔ وہ غزلیں جو مندرجِ ذیل مصرعوں سے شروع ہوتی ہیں غزل کی روایت کو بڑی حد تک نبھاتی ہیں:

۱۔ کس کس کو اب رونا ہوگا جانے کیا کیا بھول گیا
۲۔ سنبھل اے قدم کہ یہ کارگاہِ نشاط و غم بے خبر بھی ہے
۳۔ ہم گلستاں سے نہ جائیں یہ ستم ہے دیکھو
۴۔ جس طرف جاؤں اُدھر عالم تنہائی ہے
۵۔ کام آساں ہو تو دشوار بنا لیتا ہوں
۶۔ وقت بے رحم ہے لمحوں کو کچل جائے گا
۷۔ سخن رازِ نشاط و غم کا پردہ ہو ہی جاتا ہے

یہ غزلیں تقریباً مسلسل طور پر اچھی ہیں اور ان میں ایک نفسیاتی اور جذباتی ربط

ملتا ہے۔ ان کے علاوہ متفرق اشعار ان غزلوں میں بھی اور دوسری غزلوں میں بھی ہماری توجہ کو اپنی جانب مبذول کرتے ہیں۔ مثلاً:

ہائے خوشبو سے ترے درد کی نسبت نہ گئی — میں نے ہر پھول کو سینے سے لگا رکھا ہے

آگے آگے کوئی مشعل سی لیے چلتا تھا — ہائے اُس شخص کا کیا نام تھا پوچھا بھی نہیں

میری ان آنکھوں نے جیسے تجھے دیکھا ہی نہیں — ہائے وہ حسرتِ دیدار کہاں سے لاؤں

لاکھ بے مایہ سہی جنسِ گراں ٹھہرے گا — دل کبھی ٹوٹا ہوا پیمانہ جسم ہے دیکھو

یہ جو کچھ نور سا چھنتا ہے کفِ بت گر سے — میری محرابِ تخیّل کا صنم ہے دیکھو

اپنے دم سے ہے اُمنگوں کی صلیب آرائی — سرِ سودا ہے چراغِ سرِ مقتل کی طرح

ترا لہجہ ہے کہ سناٹے نے آنکھیں کھولیں — تیری آواز کلیدِ درِ تنہائی ہے

جادۂ شوق کو ویراں نہیں ہونے دیتا — روز نقشِ قدمِ یار بنا لیتا ہوں

سخن رازِ نشاط و غم کا پردہ ہو ہی جاتا ہے — غزل کہہ لیں تو جی کا بوجھ ہلکا ہو ہی جاتا ہے۔

شاذ تمکنت کا ابھی صرف ایک ہی شعری مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ ان کی اُٹھان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ ان کی شاعری کا نمایاں پہلو خوب صورت محاکات اور ایک لطیف لسانیاتی احساس ہے۔ "تراشیدہ" کی نظموں میں اس لحاظ سے ایک ناہمواری بھی ملتی ہے کہ ایک ہی نظم کے دو مصرعے نہایت چست، سڈول اور نوک پلک سے درست ہیں اور اگلے دو میں لسانی غرابت اور گراں باری پائی جاتی ہے اور یہ جھٹکے اس تواتر سے لگتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ نظم بحیثیت مجموعی کامیاب ہے یا ناکام۔ "تشنگی" اس کی ایک بین مثال ہے۔ اس میں پہلے اور چوتھے شعر کا پہلا مصرع اور چھٹے اور نویں شعر کا پہلا مصرع پورے تاثر کو بُری طرح مجروح کرتے ہیں لیکن بعض نظمیں از اول تا آخر جذبہ اور پیکر نگاری دونوں اعتبار سے موزونیت کا پتہ دیتی ہیں۔ ان میں "نیند کی وادی میں" "کھنڈر" "آخرِ شب" "سالگرہ" "بے ننگ و نام" "گریزپا" اور "نوشینہ سازم" شمار کی جا سکتی ہیں۔ بلاشبہ جو لفظی تصویریں شاذ تمکنت اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں وہ بڑی دیدہ زیب

ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان کے ہاں شعری زبان میں ضرورت سے زیادہ اہتمام وانصرام نظر آتا ہے۔ ان میں قطع وبرید کی شدید ضرورت ہے، ان کے تخیل میں جو زور، زرخیزی اور فراوانی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے یہاں الفاظ، تراکیب اور بندشوں میں افراط و تفریط کا پہلو نمایاں ہو لیکن "قطرہ سے گہر ہونے تک" کی منزل ابھی دور معلوم ہوتی ہے۔ شاذ تمکنت اپنی شعری صلاحیتوں کی جتنی تہذیب و ترتیب کریں گے اور اپنی خلقی فراوانی اور جوشِ نمو میں ضبط و اعتدال اور توازن اور تناسب کی جتنی پابندی کریں گے اتنی ہی ان کی تخلیقات کی جاذبیت میں اضافہ ہوگا۔ ان کے یہاں ایک نقاش کا موقلم اور موسیقار کی حس سماعت پوری طرح موجود ہیں۔ ایک طرح سے انھوں نے اردو کے دو کلاسیکی شاعروں یعنی مصحفی اور حسرت کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ جیسے جیسے ان کے تجربات میں وسعت پیدا ہوگی (اور فی الوقت ان کے تجربات کا دائرہ صرف رومان، تنہائی، یادوں اور شکستِ آرزو ہی تک محدود ہے) اور وہ ایجازِ بیان کو محض صنعت گری اور فراوانیٔ تخیل سے علیحدہ کر کے دیکھیں گے کہ اسی اعتبار سے ان کی تصویریں زیادہ دل کش بنیں گی۔ محاکات کی تازگی، ندرت اور قطعیت کے اعتبار سے موجودہ دور کے شاعروں کے لئے فیض کے یہاں ہمیں ایک معیار ملتا ہے۔

اس طرح اچھے فن کار کے لئے شعری ڈھانچے اور فنی دروبست کا احساس بھی ضروری ہے۔ خصوصاً نظم کی شاعری میں تخیل کی گرہیں رفتہ رفتہ کھلتی ہیں اور خیال لمحہ بہ لمحہ اور منزل بہ منزل نظم کی بساط پر محیط ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ازبس ضروری ہے کہ پورا ڈھانچہ ایک عضوی کل کی حیثیت سے سامنے آئے، نظم کی میکانیت (Architectonics) اس کے جمالیاتی احساس سے کچھ کم اہم نہیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شعر کی جمالیات اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب شعری ڈھانچہ کی تمام گنجائشیں بہ حد کمال استعمال میں لائی جا چکیں۔ شاذ تمکنت کے سامنے امکانات کا وسیع میدان کھلا ہوا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنی خلقی اپج، تخیلی زرخیزی اور جمالیاتی حس کو آئندہ کس منزل تک لے جاتے ہیں۔

فارسی: مرزا غالب

ترجمہ: گوھر ھوشیارپوری

بہ عشق از دو جہاں بے نیاز باید بود
مجاز سوزِ حقیقت گداز باید بود

بجیبِ حوصلہ نقدِ نشاط باید ریخت
بجان شکوہ تغافل طراز باید بود

چو لب زہرہ نوایانِ شوق نتواں شد
چو دل زپردہ سرایانِ راز باید بود

چو بزمِ عشرتیاں تازہ رو تواں جوشید
چو شمع خلوتیاں جاں گداز باید بود

کمر نہفتہ بتاراجِ خویش باید بست
شریکِ مصلحتِ سعیِ ناز باید بود

چو شوق بال کشاید تواں بخود بالید
چو ناز جلوہ گرائید نیاز باید بود

بہ صحن میکدہ سرمست میتواں گردید
بہ کنجِ صومعہ وقفِ نماز باید بود

بخوں تپیدۂ ذوقِ نگاہ تواں زیست
شہیدِ آں مژہ ہائے دراز باید بود

نگہ ز دیدۂ بیدار جو کہ سائل را
بہ گدیہ طالب درہائے باز باید بود

چہ بہ زراعتِ آزردگی خوری غالب
ترا کہ ایں ہمہ با برگ و ساز باید بود

طلب میں اہلِ دو جہاں سے تھا بے نیاز مرا
گداز سوزِ حقیقت سے تھا مجاز مرا

زرِ نشاط پہ تھا تنگ تر مرا دامن
نفس نفس ہے رہِ غفلت گلہ طراز مرا

مگر میں ہرزہ سرائی کو لب کشا نہ ہوا
کہ میرے دل کے صدف میں تھا لعلِ راز مرا

طرب گھروں میں وہ میرا شگفتہ رو ملنا
تو غم کدوں میں وہ رہنا بغم گداز مرا

بطورِ خود وہ مرادِ بے فنا رہنا
ہوا طریق یہ ہم مثلِ اہلِ ناز مرا

ہوائے شوق نے جینا سکھا دیا۔ ورنہ
مطیعِ ناز کچھ ایسا نہ تھا نیاز مرا

وہ میکدہ کو بھی مخمور و مست چل دینا
وہ صومعے میں بھی آ نا لئے نماز مرا

شہیدِ ذوقِ نظر ہوں کہ ذی حیات رہا
ابد بھی سلسلۂ عمر ہے دراز مرا

کشودِ چشم ضروری سمجھ کہ سائل کو
خبر ہے بابِ کرم کس طرف ہے باز مرا

لیا تو مسلکِ آزادگی سے کیا غالب
یہی کہ دہر میں ہو کچھ تو برگ و ساز مرا

شہزاد احمد

خود اپنے آپ کا احساس کب رہا ہے مجھے
میں اس لیے ہوں کہ اک شخص دیکھتا ہے مجھے
ابھی تو دن ہے خدا جانے رات تک کیا ہو
اس آفتاب نے سایا بنا دیا ہے مجھے
مرے سوا بھی کوئی ہے جو تجھ کو چاہتا ہے
اُٹھا کے آئینہ کیوں دیکھنا پڑا ہے مجھے
میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں کہ زندہ ہوں
وہ آج کل مری آنکھوں سے دیکھتا ہے مجھے
وہ جس کی دُھن میں گذاری ہے زندگی میں نے
مِلا ہے جب تو مرا نام پوچھتا ہے مجھے
مجھے یہ زعم کہ دنیا کو بھول بیٹھا ہوں
زمانہ اپنی طرف سے مٹا چکا ہے مجھے
یہ تیرگی ہے کہ ہر ایک سمت ہیں سورج
کہاں ہوں میں، مرا سایا پکارتا ہے مجھے
میں اس کو دیکھ کے حیران رہ گیا شہزاد
وہ اجنبی تھا مگر آشنا لگا ہے مجھے

احمد ندیم قاسمی

کل رات عجیب خواب دیکھا
بُجھتا ہوا آفتاب دیکھا
دھجّی دھجّی تھی دھوپ ساری
ٹکڑے ٹکڑے سحاب دیکھا
کہنے کو تو کائنات دیکھی
اک خیمۂ بے طناب دیکھا
صحرائے حیات سے نِکل کر
سنبھلے، تو وہی سراب دیکھا
انسان نے فکر ترک کر دی
ایسا بھی اک انقلاب دیکھا
اُٹھا جو ذرا سا پردۂ خیر
ہر جُرم کا ارتکاب دیکھا
اے رنگِ گُلاب کے پرستار!
مٹّی کا بھی پیچ و تاب دیکھا؟
یاد آئے نہ خال و خد اسی کے
جس شخص کو بے حساب دیکھا

خورشید احمد جامی

غموں کے شہر میں اقرارِ زندگی کیوں ہے
دلوں کے پاس ابھی تک یہ روشنی کیوں ہے

نکل کے گھر سے مری سوچ پاگلوں کی طرح
سیاہ رات کے جنگل میں گھومتی کیوں ہے

ملی تو کوئی تقاضہ نہ کر سکی مجھ سے
تمہاری یاد بھی اتنی تھکی ہوئی کیوں ہے

بھٹک رہا ہوں بگولوں کے ساتھ صحرا میں
مرے نصیب میں صدیوں کی تشنگی کیوں ہے

بیانِ درد کے اسلوب اور بھی ہوں گے
ہر ایک بات بہ عنوانِ شاعری کیوں ہے

کسی بدن کی پُر اسرار چاندنی اب بھی
مرے قریب ہی بستر پہ لیٹتی کیوں ہے

ہر ایک دَور نے معتوب جس کو ٹھہرایا
مری زبان پہ وہ حرفِ آگہی کیوں ہے

نہ جانے کون سخی اس طرف سے گذرے گا
فصیلِ شب سے پرے بھیڑ سی لگی کیوں ہے

مِٹی مِٹی سی لکیریں ہیں جس طرف دیکھو
غمِ حیات کی تصویر ایک سی کیوں ہے

کسی کو آج نہیں کل بتاؤں گا جامی
قلم کی آگ میں خوابوں کی دلکشی کیوں ہے

سلام مچھلی شہری

میری فطرت شیشۂ صہبا میں جنت دیکھنا
اور پھر خود آئینے میں اپنی صورت دیکھنا

جب بہت مسرور ہوتا ہوں تو یہ کہتا ہے دل
آنے والی ہے کوئی تازہ مصیبت دیکھنا

منزلیں آتی ہیں لیکن رُخ بدل دیتا ہوں میں
رہبرانِ وقت! میری یہ طبیعت دیکھنا

تم بھی اک افسردہ محشر ہو مگر میرے حضور
بند ہے بوتل میں اک زندہ قیامت دیکھنا

شہرِ زر کے ہر صنم خانے میں رہ کر پاک ہوں
میرے قصبے کی مساجد کی یہ برکت دیکھنا!

محفلیں تو میرے بس ہی میں نہیں ہیں دوستو
راستوں میں اب مجھے با چشمِ عبرت دیکھنا

میں تو بزمِ شعر سے کچھ دور میخانے میں ہوں
غیر کہتے ہیں، سلام آیا تو آفت دیکھنا

سلیم احمد

نیا مضموں کتابِ زیست کا ہوں
نہایت غور سے سوچا گیا ہوں
سُنیں مجھ کو تو میں دھڑکن ہوں دل کی
نہیں سُنتے تو صحرا کی صدا ہوں
مری جانب کوئی آئے تو پوچھوں
نشانِ راہ ہوں، منزل ہوں، کیا ہوں
کسی کو کیا بتاؤں کون ہوں میں
کہ اپنی داستاں بھولا ہوا ہوں
خود اپنی دید سے اندھی ہیں آنکھیں
خود اپنی گونج سے بہرا ہوا ہوں
میری سیرابیوں میں تشنگی ہے
کہ میں دریا ہوں لیکن ریت کا ہوں
وہ رَن مجھ پر پڑا ہے خیر و شر کا
کہ اپنی ذات میں اک کربلا ہوں
میرا سینہ ہے چھلنی نے کی صورت
انھیں زخموں سے میں نغمہ سرا ہوں
مجھے شبنم کا آئینہ ملا ہے
اسی میں گُل کی صورت دیکھتا ہوں
میری موجودگی سے بندگی تھی
کہ جب سے گم ہوا ہوں میں خدا ہوں

مظہر امام

شب کا افسانۂ بے باک بیاں ہو یارو!
میں ہوں مرحوم مگر تم تو جواں ہو یارو!
کل تلک شور تھا محفل میں کہ ہم اپنے ہیں!
آج آواز تو دو مجھ کو، کہاں ہو یارو!
بے تعلق تو نہ تھے اتنے سحر سے پہلے
چاند ڈوبا تو یہاں ہو نہ وہاں ہو یارو!
میں نے ماضی کے در و بام سجا رکھے ہیں
لے کے فردا کو چلے آؤ جہاں ہو یارو!
خود شناسی کے لیے کوئی بہانہ ہی سہی
یہ بھی جینا ہے؟ یقیں ہو نہ گماں ہو یارو!
آؤ توڑیں تو کسی طرح سکوتِ امروز
نغمۂ دوش کہ فردا کی فغاں ہو یارو!
زیست جو تھوڑی بچی ہے وہ گناہوں میں کٹے
ہاتھ میں جام ہو اور کوئے بُتاں ہو یارو!

حرمت الاکرام

کیا چند آنسوؤں سے بہل جائے گی یہ رات
ڈھا کر نہ جانے کتنے محل، جائے گی یہ رات
بھولو نہ عہدِ ہم سفری جاگتے رہو
نیند آگئی تو دور نکل جائے گی یہ رات
بھٹکے گی لڑکھڑائے گی، آغاز راہ ہے
پچھلے پہر کے بعد سنبھل جائے گی یہ رات
سوزِ آشنائے دردِ دل ہے اک آنچ کی ہی دیر
گل کر دو شمع ورنہ پگھل جائے گی یہ رات
خورشید صبح پائے گا کیا راکھ کے سوا
پہنچی افق کے پاس تو جل جائے گی یہ رات
حُرمت اسے بھی چاہیئے اک دردِ لازوال
دامن میں لے کے میری غزل جائے گی یہ رات

عارف عبدالمتین

بے رنگ پیرہن کا نہ اتنا ملال کر
اپنے لہو کو دیکھ کبھی خود اُچھال کر
موجِ صدا اُٹھا کوئی بحرِ سکوت سے
اس سنگ سے دکھا کوئی پیکر نکال کر
کیوں تیرے خد و خال پہ شیدا ہے کائنات
آنکھوں میں میری جھانک کے خود سے سوال کر
قائم ہے اب بھی ایک جہاں میں ترا بھرم
اپنا مقام اپنی نظر میں بحال کر
میری بھی ہے تجھ سے تو تیرا کمال ہے
لایا ہے خود کو تو مرے سانچے میں ڈھال کر
یہ ہاتھ موتیوں سے تہی ہیں تو کیا، یہ دیکھ
آیا ہوں کتنے گہرے سمندر کھنگال کر
عارف خزاں کی تیز ہوا پھر فدا نہ ہو
آنگن کے ان مہکتے گلوں کا خیال کر

فضیل جعفری

کیا اُس سے ملئے، اور بھی دل کو جلائے گا
فرضی معاشقوں کے فسانے سُنائے گا

کچھ لوگ تو خلاف ہوں، حاسد کوئی تو ہو
کیا لطف سیدھی سادی محبت میں آئے گا

جب روٹھ کر گیا ہے تو مت آ کے مجھ سے یُوں
منظر تری شکست کا دیکھا نہ جائے گا

سارے بدن میں لمس کی شمعیں سی جل اُٹھیں
کس کو خبر تھی یوں بھی اچانک وہ آئے گا

دھو لیں فضیلؔ بہتے ہوئے پانیوں میں ہاتھ
پتھر سے دوستی کوئی کب تک نبھائے گا

وزیر آغا

صورت سے آشنا تھا مگر جانتا نہ تھا
پہچان کر بھی مجھ کو وہ پہچانتا نہ تھا

مر جائے گی ہوا مجھے اس کا گماں نہ تھا
تھک جائے گی صدا مرا جی مانتا نہ تھا

آخر اُسی نے تجھ پہ نچھاور کیا لہُو
وہ شخص جس کو اپنا تو گردانتا نہ تھا

وہ دن بھی یاد کر کہ بھرے شہر میں یہاں
تیرے سوا کوئی بھی تجھے جانتا نہ تھا

میں خوش کہ مل سکا تجھے اک اجنبی کی طرح
تو مطمئن کہ میں تجھے پہچانتا نہ تھا

قمر اقبال

ہر ایک شخص بھٹکتا غبار ہو جیسے
یہ شہر، شہر نہ ہو ریگ زار ہو جیسے

کبھی گزرتی نہ تھی رات اتنی آہستہ
اسے بھی آج ترا انتظار ہو جیسے

وہ اک صدا جو مسلسل سُنائی دیتی ہے
ہمارے اپنے لہو کی پُکار ہو جیسے

کچھ اس طرح ہیں خیالات بکھرے بکھرے سے
کہ ذہن، پیرہنِ تار تار ہو جیسے

وہ بنتِ موسمِ گل ساتھ ہے تو لگتا ہے
قدم قدم پہ ہجومِ بہار ہو جیسے

سُلطان اختر

جس کو قریب پایا اسی سے لپٹ گئے
سورج ڈھلا تو لوگ قبیلوں میں بٹ گئے

کس کس کی مَیں ہجوم میں آنکھیں نکالتا
اچھا ہوا کہ آپ دریچے سے ہٹ گئے

جن حوصلوں پہ کوہِ گراں کا گُمان تھا
آندھی چلی تو سیکڑوں حصوں میں بٹ گئے

ٹھٹھرے ہوئے بدن کو حرارت نہ مل سکی
چھت پر چڑھے تو دھوپ کے سائے سمٹ گئے

جو قہقہے کہ جان سے زیادہ عزیز تھے
زندہ دلی کے نام پہ کل وہ بھی بٹ گئے

یوں تو مری دفاع کی شمشیر کُند تھی
اس کی جسارتوں کے مگر ہاتھ کٹ گئے

وہ گُل پرست جن پہ بہاروں کو ناز تھا
آئی خزاں تو پائے خزاں سے لپٹ گئے

مجتبیٰ حسین

تکیہ کلام

"تکیہ کلام" سے یہاں ہماری مراد وہ تکیہ کلام نہیں جو بات چیت کے دوران میں بار بار مداخلت جا بیجا کرتا ہے بلکہ یہاں تکیۂ کلام سے مراد وہ کلام ہے جو تکیوں پر زیورِ طبع سے آراستہ ہوتا ہے اور جس پر آپ اپنا سر رکھ کر سو جاتے ہیں اور جو آپ کی نیندیں "حلال" کر دیتا ہے۔ پرسوں کی بات ہے کہ ہم نے ایک محفل میں غالبؔ کا وہ شعر پڑھا کہ ؎

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

اس شعر کو سُن کر ایک صاحب پہلے تو چونکے، پھر گہری سوچ میں غرق ہو گئے اور اپنا سر کھُجاتے ہوئے بولے: "اگر میرا حافظہ خراب نہ ہوا ہو تو یہ شعر میں نے ضرور کہیں پڑھا ہے"۔ ہم نے ان کی یادداشت کا امتحان لینے کی خاطر پوچھا: "تب تو سوچ کر بتائیے آپ نے یہ شعر کہاں پڑھا تھا؟" وہ کچھ دیر سوچ کر بولے: "بھئی لو یاد آیا، یہ شعر ہم نے رحمٰن خاں ٹھیکے دار کے تکیہ کے غلاف پر پڑھا تھا"۔ بھلا تمہیں یہ شعر کس طرح یاد ہو گیا؟ کیا تمہیں بھی اُس تکیہ پر سونے کا اتفاق ہوا تھا۔" ہم نے کہا: "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ شعر تو دیوانِ غالبؔ میں موجود ہے، رحمٰن خاں ٹھیکے دار سے ہمارا کیا تعلق؟" اس پر وہ بولے: "بھئی! دیوانِ غالبؔ سے ہمارا کیا تعلق! ہم تو شعر و شاعری صرف تکیوں کے غلافوں پر

پڑھ لیتے ہیں، جو شاعری آپ کو تکیوں کے غلافوں پر پڑھنے کو مل جاتی ہے اس کے لئے شعرار کے دواوین اُلٹنے پلٹنے کی کیا ضرورت ہے ؟" اور ان صاحب کے جواب کو سُن کر ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ جس زبان میں شعر و شاعری کی بہتات ہوتی ہے وہاں شعر و شاعری کا یہی حشر ہوتا ہے۔ شاعری کا "پیمانۂ صبر" اتنا لبریز ہو جاتا ہے کہ اشعار چھلک کر تکیوں پر گر جاتے ہیں، چادروں پر بکھر جاتے ہیں، لاریوں کی پیشانیوں پر چپک جاتے ہیں، رکشاؤں کی پیٹھ پہ بیٹھ جاتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ دستر خوانوں تک کی زینت بن جاتے ہیں۔ کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ ہم دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھے ہیں کہ اچانک دستر خوان پر چنے ہوئے کسی شعر نے ہمیں چونکا دیا اور ہم کھانا کھانے کی بجائے سر دُھنتے رہ گئے۔ بعض سخن فہم حضرات تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو دستر خوان پر "فارسی میڈیم" میں اشعار لکھواتے ہیں، جیسے ؎

شکر بجا آر کہ مہمانِ تو
روزیٔ خود می خورد از خوانِ تو

نتیجہ ان فارسی اشعار کی اشاعت کا یہ ہوتا ہے کہ مہمان کھانا کم کھاتے ہیں اور اس شعر کے معنیٰ و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش زیادہ کرتے ہیں اور یوں جب وہ معنیٰ و مفہوم کے چکر سے آزاد ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ میزبان نے سارا کھانا خود ہی کھا لیا ہے۔

دستر خوانوں کے اشعار کی بات چھوڑیئے کیوں کہ اب ہم دستر خوانوں پر چُنی جانے والی اشیائے خورد و نوش میں مختلف ملاوٹوں کے علاوہ اشعار کی ملاوٹ کے بھی عادی ہو گئے ہیں، اور یہاں بات 'تکیوں' اور اُن کے 'کلام' کی چل رہی ہے اور ہم نے ایسے معرکتہ الآرا شعر تکیوں پہ دیکھے ہیں کہ اگر کوئی ان تکیوں پر سو جائے تو پھر زندگی بھر ان تکیوں پر سے اُٹھنے کا نام نہ لے۔

ہمیں ایک بار سفر پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک شناسا کے ہاں مہمان ٹھہرے۔ حسب روایت، ہم چونکہ بستر اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے اس لئے میزبان نے ہمارے بستر کا

انتظام کیا۔ اب جو ہم بستر پہ پہنچے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ تکیہ پہ نہایت جلی حروف میں یہ شعر لکھا ہوا ہے کہ ؎

کسی کے حسن کا جادو بسا ہے تکیہ میں
جہانِ عارض و گیسو بسا ہے تکیہ میں

اب آپ سے کیا بتائیں کہ ہمارے حق میں یہ بستر، بسترِ مرگ ثابت ہوا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے، اختر شماری تک کرتے رہے۔ ہر بار یہی سوچتے رہے کہ آخر تکیہ میں کس کے حسن کا جادو بسا ہے، آخر وہ کون مہ جبیں ہے جس کا جہانِ عارض و گیسو اس تکیہ میں پنہاں ہے۔ بار بار اس تکیہ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اس تکیہ نے ہم میں وہ سارے آثار پیدا کر دیئے جو آغازِ عشق کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ وفورِ عشق نے اتنا سر اُٹھایا کہ ہم بار بار تکیہ پہ اپنا سر پٹکتے رہے۔ بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح ہو گی تو ہم اس نازنین کو ضرور دیکھیں گے جس کے حسن کا جادو اس تکیہ کے توسط سے ہمارے سر پہ چڑھ کر بول رہا ہے۔

صبح ہوئی تو ہم نے چوری چھپے اُس نازنین کو دیکھ ہی لیا اور اُس نازنین کے ڈیل ڈول اور وضع قطع کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پہ پہنچے کہ محترمہ کو یہ شعر تکیہ پہ نہیں بلکہ "گاؤ تکیہ" پہ لکھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ان کے حسن کا "سمبل" صرف گاؤ تکیہ ہی ہو سکتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد سے تکیہ کے اشعار پر سے نہ صرف ہمارا ایقان اُٹھ گیا بلکہ جب بھی کوئی منظوم تکیہ ہمارے سر کے نیچے آیا تو ہم نے چپکے سے اس کا غلاف اُتار لیا کہ کون اپنی نیند حرام کرے۔ آپ نے تکیوں کے وہ اشعار ضرور پڑھے ہوں گے جن پہ سو کر آپ نہایت ڈراؤنے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ عرض کیا ہے ؎

کونین تک سمیٹ لئے ہیں غلاف میں
ٹکڑے جگر کے ٹانک دیئے ہیں غلاف میں

خواب ہائے دل نشیں کا اک جہاں آباد ہو
تکیہ جنت بھی اُٹھا لائے اگر ارشاد ہو

⁖

چمن در چمن ہے غلاف آئیے تو
ذرا اس پہ آرام فرمائیے تو

⁖

غنچہ ہائے دل کھلے، سر رکھ کے گستاخی معاف
گلشنِ امید کے سب پھول چُن لایا غلاف

⁖

غور فرمائیے کہ ان اشعار پہ کیا آپ "تکیہ" کر سکتے ہیں، گویا تکیہ نہ ہوا الہ دین کا چراغ ہوا کہ کونین تک اس میں سمٹ کر آ گئے ہیں۔

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے ایک دوست کو 'ادھورے' خواب' دیکھنے کی بیماری تھی، وہ تھوڑا سا خواب دیکھتے کہ بجلی فیل ہو جاتی اور وہ نیند سے چونک پڑتے۔ ایک دن ہم سے بولے: "بھئی عجیب بات ہے کہ مجھے اُدھورے خواب نظر آتے ہیں۔ آخر پورے خواب کیوں نظر نہیں آتے۔ میں خوابوں کے 'ٹریلر' دیکھتے دیکھتے عاجز آ گیا ہوں۔" ہم نے ان کے بستر کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ تکیہ پہ ایسا شعر لکھا ہوا ہے جو بحر سے خارج ہے۔ اس پہ ہم نے کہا: "بھئی اس کا اصل راز یہ ہے کہ تم ایسے تکیہ پہ سوتے ہو جس پہ بے بحر شعر لکھا ہوا ہے اور اس تکیہ کی کرامت سے تمہارے خواب بھی بحر سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس شعر کو بدلو تو تمہارے خوابوں کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔"

یہ تو ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ ہمارے ایک اور دوست کا قصہ ہے کہ انھیں عرصہ سے "بلڈ پریشر" کی شکایت تھی۔ جب وہ بستر پہ سو جاتے تو ان کا "بلڈ پریشر" آسمان سے باتیں کرنے

لگتا۔ جب ایلوپیتھی علاج سے فائدہ نہ ہوا تو ایک حکیم صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ حکیم صاحب نے ان کا بغور معائنہ کیا۔ ساری دکھتی رگیں پکڑ کر دیکھیں۔ زبان اتنی بار باہر نکلوائی کہ وہ ہانپنے لگے۔ مگر اسی اثنا میں حکیم صاحب کی نظر تکیہ پر پڑی اور وہ تکیہ کی جانب لپکے، شعر کو غور سے پڑھا اور ٹھٹک کر بولے: اس تکیہ کو ابھی یہاں سے ہٹائیے۔ بلڈ پریشر کی اصل جڑ تو اِن تکیہ میں ہے۔ واہ صاحب واہ! کمال کر دیا آپ نے۔ آپ کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور آپ نے شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا شعر تکیہ پر طبع کر وا رکھا ہے۔ جانتے ہو جوشؔ کی شاعری میں کتنا جوش ہوتا ہے۔ جوشؔ کے شعر پر آپ سوئیں گے تو دوران خون نہیں بڑھے گا تو اور کیا ہوگا؟ اس تکیہ کو اسی وقت یہاں سے نکالئے، خبردار جو آئندہ سے آپ نے جوشؔ کے تکیہ پر سر رکھا۔ اگر شعروں پر سونا ایسا ہی ضروری ہے تو داغؔ کے غلاف پر سو جائیے، جگرؔ کے غلاف کو اپنے سر کے نیچے رکھئے۔ ان شعرا کا کلام آپ کے بلڈ پریشر کو کم کر دے گا۔ آپ کو فرحت ملے گی، بھوک زیادہ لگے گی۔ آپ کے جسم میں خون کی مقدار میں اضافہ ہوگا۔" وغیرہ وغیرہ۔

حکیم صاحب کے اس مشورے کے بعد ہمارے دوست نے نہ صرف "جوشؔ کا غلاف" بدل دیا بلکہ اب وہ جوشؔ کے کلام کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں کہ کہیں پھر بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق نہ ہو جائے۔

لیکن تکیوں کے کلام کی ایک افادیت بھی ہوتی ہے، جس کا راز صرف اہل دل ہی جانتے ہیں۔ راز یہ ہے کہ ایک صاحب کی شادی صرف تکیوں کے ان ہی اشعار کے باعث ہوئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ یہ صاحب کہیں مہمان گئے ہوئے تھے۔ رات کو میزبان کے گھر میں سے ان کے لئے جب بستر آیا تو اس میں ایک تکیہ بھی تھا جس پر یہ شعر لکھا تھا ؎

شمیم طُرّۂ گیسوئے یار لایا ہوں
میں اپنے ساتھ چمن کی بہار لایا ہوں

آدمی چونکہ ہوشیار تھے، اس لئے اس غلاف کا مطلب سمجھ گئے۔ دوسرے دن بازار گئے اور ایک ریڈی میڈ غلاف خرید لائے، جس پر یہ شعر لکھا تھا ؎

اُٹھا تو سر پٹک دیا تکیہ پہ بار بار
شب بھر گواہ یہ بھی مرے دردِ دل کا تھا

اُنھوں نے چپکے سے تکیہ کا پُرانا غلاف اُتارا اور اپنا نیا غلاف اُس پر چڑھا دیا۔ اب یہ تکیہ ان کا پیام لے کر اندر واپس ہوا۔ نہ جانے اس شعر نے اندر کیا کیا قیامت مچائی۔ مگر شام میں جب پھر تکیہ واپس ہوا تو اس پر ایک نیا شعر لکھا تھا ؎

مرا جذبِ دل میرے کام آ رہا ہے
اب اُن کی طرف سے پیام آ رہا ہے

دوسرے دن، ان صاحب نے یہ غلاف بھی اُتار لیا اور پھر ایک طبع زاد غلاف چڑھا دیا، جس کے بول تھے ؎

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

غرض اس تکیہ بردارِ عشق نے وہ جوش مارا کہ سلام و پیام کا سلسلہ بڑھتا رہا۔ اور بالآخر ان دونوں کی شادی ہو گئی اور اب یہ دونوں ایک ہی شعر پر تکیہ کر رہے ہیں لیکن اب ان تکیوں کے اشعار کی ' ماہیئتِ قلبی' تبدیل ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہم نے برسوں ان کی خواب گاہ میں جو تازہ تکیہ دیکھا تھا، اُس پر یہ شعر درج تھا ؎

اس سیہ بخت کی راتیں بھی کوئی راتیں ہیں
خوابِ راحت بھی جسے خوابِ پریشاں ہو جائے

یہ تو خیر عام آدمیوں کے تکیوں کی بات تھی۔ اگر آپ کو 'دانش مندوں' کے تکیوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ یقیناً 'دنگ رہ گئے' ہوں گے۔ ان تکیوں پر ایسے صوفیانہ اور فلسفیانہ اشعار لکھے جاتے ہیں کہ اچھا خاصا آدمی فلسفی بننے کی کوشش کرنے بیٹھتا ہے۔ مثلاً ایک انٹلکچول قسم کے صاحب نے اپنے تکیہ پر یہ شعر لکھا رکھا تھا ؎

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

سچ پوچھیے تو اس تکیہ پر کوئی عام آدمی سو ہی نہیں سکتا۔ ایسے فلسفیانہ شعر پر تو صرف ایک دانش مند ہی سو سکتا ہے اور اسی کو ایسے فلسفیانہ تکیے زیب دیتے ہیں۔ آیئے، اب ذرا شعراء کے تکیوں کی بات ہو جائے، جن کے لئے شاعری اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے، یعنی ان کے تکیوں پہ شعر ہوتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ ہم نے ایک شاعر صاحب کی 'مچھر دانی' پر بھی شعروں کا جنگل اُگا ہوا دیکھا ہے۔ ہم نے ایک شاعر کے گھر میں ایک 'منظوم تکیہ' دیکھا جس پر یہ شعر درج تھا ؎

یار سوتا ہے بصد ناز بصد رعنائی
محوِ نظارہ ہوں بیدار کروں یا نہ کروں

ہم نے اس شعر کو پڑھ کر کہا: "بھئی واہ کیا خوب شعر کہا ہے، کس کا شعر ہے؟" ہمارے سوال کو سُن کر ان کا چہرہ تمتما اُٹھا اور بولے: "معاف کیجیے، میں کسی دوسرے کے کلام پہ تکیہ نہیں کرتا۔ یہ شعر میرا ذاتی ہے اور یہ بات میری خودداری کے خلاف ہے کہ میں دوسروں کے اشعار پہ سو جاؤں۔ آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کوئی شاعر اپنے تکیہ پہ میرؔ کے تکیہ کا شعر لکھ مارے کہ ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے"

ہم نے ان کا غصہ دیکھ کر معافی مانگ لی اور چپ ہو رہے۔ بعد میں ان کے گھر کی اشیاء پر جو نظر ڈالی تو ہر شے شعر میں لت پت نظر آئی۔ پھر بہت دنوں بعد پتہ چلا کہ ان شاعر صاحب کی جو غزلیں مختلف رسالوں سے 'ناقابلِ اشاعت' قرار پا کر واپس آتی ہیں، اُنھیں وہ اپنے گھر کی چادروں پر چھپوا دیتے ہیں، تکیوں کے غلافوں پر چڑھا دیتے ہیں اور اُنھیں میز پوشوں پر زیورِ طبع سے آراستہ کرتے ہیں۔ ہم تکیوں کے ذریعہ ادب کی ترقی کے ضرور قائل ہیں لیکن ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ 'ناقابلِ اشاعت' اشعار بھی تکیوں پر چھاپے جائیں۔ پھر ہماری شاعری میں نئے رجحانات آ رہے ہیں تو تکیوں میں بھی نئے رجحانات کا آنا نہایت ضروری ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی سخن فہم صاحب اپنے تکیہ پر آزاد نظم لکھوالیں۔ اگر تکیہ اس نظم کو قبول کرنے کے معاملہ میں 'تنگ دامنی' کا شکوہ کرے تو اس نظم کو دو تین تکیوں پر شایع کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً نظم کا ایک بند تو ایک تکیہ پر ہو اور اس کے نیچے یہ عبارت درج ہو :

"براہِ کرم تکیہ اُلٹیے" اور تکیہ اُلٹنے پر بھی کام نہ بنے تو نیچے یہ عبارت لکھی جائے کہ: "باقی نظم ملاحظہ ہو گاؤ تکیہ نمبر (۱) پر" اور گاؤ تکیہ بھی اس کی طوالت کو برداشت نہ کر سکے تو اس کے نیچے لکھا جائے : "باقی نظم ملاحظہ ہو شطرنجی کلاں پر" اور جب یہ نظم ختم ہو جائے تو اس کے نیچے 'غیر مطبوعہ' کے الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ 'منظوم تکیوں' کے شائقین اپنے تکیوں کو شاعری کے جدید رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی فرمائیں گے۔

سب سے آخر میں ہم اس مضمون کے لئے ان خاتون کے تہہ دل سے مشکور ہیں جن سے ہم نے تکیوں کے چند اشعار مانگے تو انھوں نے اپنے نوکر کو ہمارے گھر بھیجا۔ اس نوکر نے آتے ہی ہم سے کہا: "صاحب اپنے نوکر کو باہر بھیجئے تاکہ وہ تکیے کے اشعار رکشہ میں سے اُتار سکے"۔

ہم نے حیرت سے پوچھا: "تمھاری بیگم صاحبہ نے آخر اتنے اشعار کیوں بھیجے کہ اُنھیں رکشہ میں ڈال کر تمہیں ہمارے یہاں لانا پڑا ہے"۔

وہ بولا : "صاحب، آپ نے بیگم صاحبہ سے تکیہ کے اشعار مانگے تھے اور انھوں نے اپنے گھر کے سارے تکیے، آپ کے بھجوادئے ہیں۔ آپ ان تکیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد انھیں واپس بھیج دیجئے۔"

پھر ہم اس دھوبی کے بھی مشکور ہیں جو گھاٹ پر کپڑے دھو رہا تھا۔ ہم نے اس دھوبی کو دیکھا کہ وہ ایک کپڑا پانی میں سے نکالتا ہے، اُسے کھولتا ہے، پھر اپنی عینک آنکھوں پر لگاتا ہے، کپڑے پر کوئی عبارت پڑھتا ہے اور پھر اُسی کپڑے کو پتھر پر زور زور سے پٹخنے لگتا ہے۔ ہم نے اس کی اس حرکت کا بغور مشاہدہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ بعض کپڑے تو زور سے پٹختا ہے اور بعض کپڑے نہایت آہستگی اور سلیقے سے دھوتا ہے۔

ہم نے پوچھا : "بھئی! تم بعض کپڑے زور سے پٹختے ہو اور بعض نہایت آہستگی سے، آخر یہ کیا راز ہے ؟"

وہ بولا : "صاحب! یہ دراصل تکیے کے غلاف ہیں اور میں تکیے کے ہر غلاف کو دھونے سے پہلے اُسے کھولتا ہوں اور اس پر لکھا ہوا شعر پڑھتا ہوں، اگر شعر مجھے پسند نہ آئے تو اس غلاف کو زور زور سے پتھر پر پٹختا ہوں، یعنے ادبی اصطلاح میں "ہوٹنگ" کرتا ہوں اور اگر اتفاق سے کوئی شعر پسند آئے تو اسے نہایت سلیقے سے دھوتا ہوں کہ اچھا شعر ساری قوم کی امانت ہوتا ہے۔"

ہم اس ادب دوست دھوبی اور اس کے گدھے کے بھی، جو اُن اشعار کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے پھرتا ہے، مشکور ہیں کہ اس نے بعض اچھے اشعار ہمیں فراہم کیے جو اس مضمون میں شریک نہیں ہیں۔

مظفر حنفی

ڈوبنے جاؤں تو...

کرارے نوٹ
چھن چھن بولتے سکّے
شیئر، ہنڈی
چمکتی میز، الماری
نگر کے سیٹھ
افسر
اور پھر اُن کے حواری
کلرکوں کی زباں پر موٹے موٹے ہندسے جاری
قلم بھاری
فضا میں بینک کی
ہر سمت اک سنجیدگی طاری

نہ جانے کیسے چوکیدار کی آنکھیں بچا کر
نیم خبطی اک بھکاری
کب بڑے صاحب کے کمرے میں در آیا
(لگا تھا پیٹھ سے جو) پیٹ دکھلایا

کہا:
"سرکار!
مل جائے اگر اک دس کا سکّہ
میں چنے لے کر چبا لوں
پیٹ کا دوزخ بجھا لوں"
جواباً:
قہقہوں سے گونج اُٹھی بینک کی ساری عمارت
کھُل گئی جیسے کمانی....
جی!
سمندر میں نہ تھا پینے کا پانی!!!

میرا دوسرا بچّہ کب ہونا چاہیئے؟



ڈاکٹروں کا کہنا ہے: بچّے کی نشوونما میں پہلے چار پانچ برس کا عرصہ بہت اہم ہوتا ہے۔ ماں کی بہتر صحت کے لئے بھی ضروری ہے کہ دوسرا بچّہ تین چار برس بعد ہو۔

آج کل آپ برتھ کنٹرول کے متعدد محفوظ، مؤثر اور سادہ طریقوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اب بچّے کا جنم اتفاق کی بات نہیں —— یہ آپ کے اختیار میں ہے۔

مفت مشورے اور خدمات کے لئے قریبی فیملی پلاننگ سینٹر میں آج ہی تشریف لائیں۔

اور یاد رکھیں ...



بچّے دو ہی کافی ہیں



davp 68/289

مکتبہ شاہکار سے آپ مندرجہ ذیل کتابوں کے علاوہ اپنی پسند کی ہر کتاب طلب فرما سکتے ہیں ۔ شاہکار کے خریداروں کو خاص رعائت دی جائے گی ۔

نثر و غزل دستہ	(کلیات نثر و نظم، شاد عارفی)	مرتب : مظفر حنفی	-/۸
اینٹ کا جواب	(افسانے)	"	-/۴
اعتبار نظر	(مضامین)	احتشام حسین	۴/۵۰
کل کی باتیں	(افسانے)	رام لعل	-/۵
مجازیات اور شاعری	(تنقید)	منظر سلیم	۴/۵۰
بہار کا پہلا دن	(ناول)	علاء الدین آزاد	-/۴
سپہ سالار خلجی	(ناول)	مائل ملیح آبادی	-/۵
دارا شکوہ	(ناول)	قاضی عبد الستار	۴/۵۰
چاندنی اساڑھ کی	(مجموعہ کلام)	راج نرائن راز	-/۳
نور فردا	(مجموعہ کلام)	عتیق احمد عتیق	-/۳
غزل انسائیکلو پیڈیا	(شعری انتخاب)	ذکی کاکوروی ۔ ایم ۔ اے (علیگ)	-/۵
ملا نصیر الدین کے لطیفے	(مزاحیہ)	احمد جمال پاشا	-/۴
فن لطیفہ گوئی	(پھڑکتے لطیفے)	"	-/۳
ہجویات میر	(انتخاب ہجویات)	"	۳/۵۰
شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت	(تنقید)	"	-/۳
ستم ایجاد	(طنز و مزاح)	"	۴/۵۰
تنقیدی مطالعہ	(تنقید)	پروفیسر انور سیوانی	-/۳
کھویا ہیں غزل	(شعری انتخاب)	مرتب : دلکش ساگری	۲/۵۰

"سائے کا سفر"

ممتاز افسانہ نگار عوض سعید کے افسانوں کا پہلا مجموعہ

(زیرِ طبع)

"عوض سعید ایک ایسا افسانہ نگار ہے جس کی کہانیاں پڑھنے والوں کو اُسے ڈھونڈنے پر اُکساتی ہیں اور جب ملنے پر بھی اس سے ملاقات نامکمل رہ جاتی ہے تو پھر اس کی تحریروں میں دوبارہ اسے تلاش کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

خلیل الرحمٰن اعظمی

"عوض سعید کے افسانوں کی خاص بات کردار نگاری ہے۔ اس کے ہر اہم کردار کے اندر ایک اور کردار چھپا ہوتا ہے جو باہر نکلنے کے لئے بالائی چھلکے کو برابر ٹھونگیں مارتا رہتا ہے اور جہاں زمین نرم اور گداز پاتا ہے وہیں سے سطح کو توڑ کر ایک دھماکے کے ساتھ باہر آجاتا ہے۔ حرامی، ملتانی، حکیم صاحب اور متعدد دوسرے کرداروں کے سلسلہ میں افسانہ نگار کی یہ شعبدہ گری بہت کامیاب رہی ہے۔"

وزیر آغا

ناشر: حلقۂ اربابِ ذوق حیدرآباد

شاہکار کا اگلا خاص نمبر

احتشام حسین نمبر

ایک اہم ادبی دستاویز ہوگا

تاریخ اشاعت کا انتظار کیجئے

بقیہ اپنی بات:

کے ساتھ وہ مخاصمانہ رویہ نہیں ہے جو حکومت یو۔ پی کا رہا ہے۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ ان ریاستوں میں اُردو کے ساتھ بہت دوستانہ یا ہمدردانہ رویہ نہیں اختیار کیا گیا۔ اردو کو جو کچھ ملا ہے وہ اُردو والوں کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ دور کیوں جائیے، ریاست بہار ہی کو لے لیجئے۔ وہ بھی ہندی ریاست ہے لیکن وہاں اسکولوں اور کالجوں یا یونیورسٹی سے اردو نہیں نکالی جا سکی لیکن یو۔ پی میں اُردو کا کیا حال ہے؟ اب بھی وقت ہے کہ ہم جو اپنے صوبہ کو اردو کی جنم بھومی کہتے ہیں اردو کی حفاظت اور بقا کے لئے صدق دل سے کام کرنے کو اُٹھ کھڑے ہوں ورنہ وہ دن دور نہیں جب اردو کی یہی جنم بھومی اُردو کا پہلا قبرستان بن جائے گی۔

اس بار آپ کو 'شاہکار' کے اندرونی سرورق پر ایک اور نام بھی نظر آئیگا۔ آپ شاید اسے قدامت پسندی کہیں کہ آج کل یہ چیز متروک ہوگئی ہے لیکن ہم نے بخوشی ایک ایسے انسان کو 'شاہکار' کا سرپرست بنایا جس نے 'شاہکار' کی سرپرستی کی پہلی شرط یہ رکھی ہے کہ ہم اس ادبی ڈائجسٹ کا معیار گرائیں گے نہیں۔ پنڈت نیائے شرما اگرچہ خود فلمی دنیا کے ایک معزز فرد ہیں لیکن ہم نے اُنھیں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے زیادہ جانا تھا اور جب ملے تو اُن کی شخصیت میں سب سے نمایاں وصف یہی نظر آیا کہ وہ نہ صرف ادیب ہیں بلکہ اردو زبان و ادب سے والہانہ شیفتگی بھی رکھتے ہیں۔ ہم نے جب ان سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا کہ ایجنٹ حضرات چاہتے ہیں کہ 'شاہکار' میں بھی کچھ جاسوسی کچھ جنسی اور کچھ فلمی مضامین ہوں اور سرورق پر کسی فلمی حسینہ کی تصویر، تو شرما جی نے قدرے درشت لہجے میں فرمایا تھا: "ہرگز نہیں۔ 'شاہکار' کو ادبی ڈائجسٹ ہی کی حیثیت سے زندہ رکھئے ورنہ مار ڈالیے۔ آپ صرف فلمی اشتہار شایع کر سکتے ہیں لیکن فلمی خبریں تک نہ چھاپئے گا۔ بہت سے پرچے ہیں جو یہ سب چیزیں چھاپتے رہتے ہیں۔ 'شاہکار' کے کردار کو بے داغ رکھئے۔" اور اگرچہ شرما جی نے اس کی اجازت بھی نہیں دی تھی لیکن ہم اُن کا نام شایع کر رہے ہیں اور ہمیں مسرت بھی ہے اور فخر بھی۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ 'شاہکار' کی اشاعت میں تاخیر کا سبب مدیر 'شاہکار' کے یہی دورے تھے۔ 'شاہکار' کے قدر دانوں کو ہر جگہ یہی شکایت رہی کہ پرچہ پابندیٔ وقت سے شایع ہونا چاہئے۔ راقم الحروف ہر ایک سے یہی کہتا رہا کہ اب ایسا نہ ہوگا اور خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔

محمود احمد ہُنر